
فضل محمود
اور
کرکٹ

فضل محمود

اور

کرکٹ

فضل محمود اور کرکٹ

اوول کے ہیرو اور پاکستان کے عظیم باؤلر

فضل محمود کی زبانی

- اس کی کرکٹ لائف کی ابتداء، ترقی اور نقطۂ عروج کا دلکش خاکہ۔
- بھارت اور انگلستان سے میچوں کی دلچسپ اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی کہانی۔ اوول کے میدان میں فتح کا پس منظر اور صحیح وجوہ۔
- کرکٹ کے اسرار و رموز۔
- آئندہ میچوں کے لئے پاکستانی کھلاڑیوں کا فنی جائزہ اور توقعات۔

دارالبلاغ • لاہور

پبلشرز

دارالبلاغ، محمد نگر، اقبال روڈ، لاہور

(مغربی پاکستان)

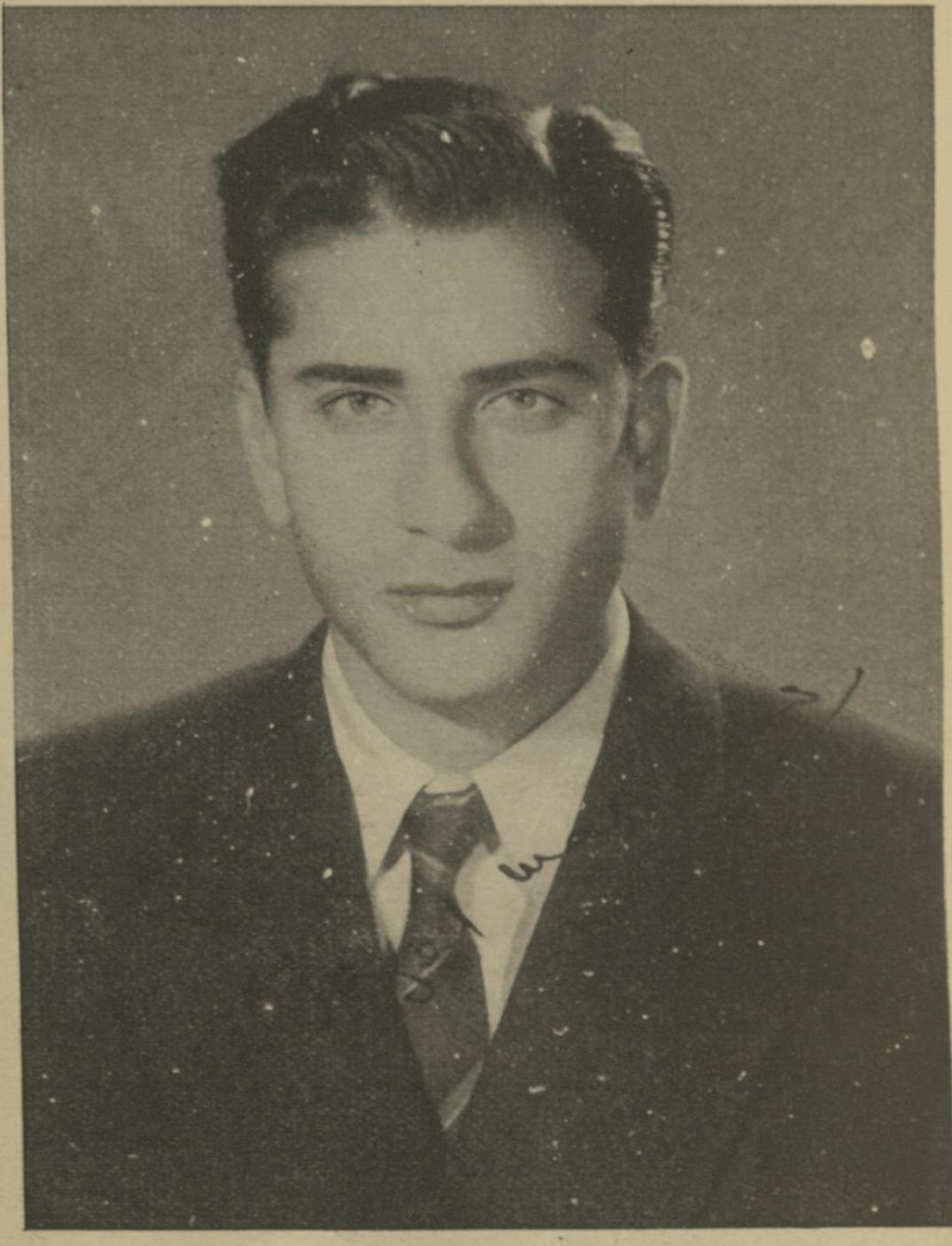
جنوری ۱۹۵۵ء

والدہ مرحومہ فضل محمود کے نام!

جس نے اس عظیم باؤلر کو نہایت شفقت سے پالا، پوسا اور پروان چڑھایا۔ جس کے مبارک قدم چھو کر وہ ہمیشہ کھیل کے میدان میں جاتا اور اپنی پشت پر ایک زبردست طاقت محسوس کیا کرتا۔ جس کی دعائے نیم شبی کی مقدس صدائیں اس گمنام کو شہرت و عروج کے عرش تک لے اڑیں۔

—— آپ کا محبوب باؤلر اب بھی کھیل کے میدان میں اترنے سے پہلے مرحومہ کے مرقد پہ پہنچ کر اس پاک روح سے مخاطب ہو کر دعا و برکت کا طالب ہوتا ہے۔ اسے کامل یقین ہے کہ انہی دعاؤں کے طفیل وہ اوول کا ہیرو بنا۔

بدرالاسلام فروغی



اوول کے ہیرو اور پاکستان کے عظیم باؤلر
فضل محمود

اس کتاب کے مرتب



خواجہ بدر السلام فروغی ڈائرکٹر دار البلاغ لاہور

آفرینشِ خیال

امسال ۲۰ اکتوبر کی شام کو فضل محمود صاحب انگلستان کے دورہ سے فاتحِ اوّل کی حیثیت سے بذریعہ کراچی میل لاہور پہنچے تو بے انداز پبلک کے ساتھ لاہور اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا خوش قسمتی سے مجھے ممدوح کے والدِ بزرگوار سے دیرینہ نیاز حاصل ہیں۔ اس لئے فضل محمود صاحب کی آمد پر ان کا خیر مقدم کرنے میں مجھے دوگونہ خوشی تھی۔ میں پلیٹ فارم پر جس جگہ دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھا حسنِ اتفاق سے اسی جگہ کے سامنے ریل کا وہ ڈبہ ٹھہرا جس میں فضل محمود صاحب پہلے سے پھولوں سے لدے کھڑے تھے۔ چند من چلے احباب نے اچک کر انہیں مزید ہار پہنانے کی کوشش کی تو اپنے دوستوں کو زحمت سے بچانے کے لئے فضل محمود

صاحب نے ڈبہ کے دروازہ سے پلیٹ فارم پہ ایک شاندار
چھلانگ لگا کر جسمانی پھرتی کا دلچسپ مظاہرہ کیا۔ تھوڑی
دیر کے لئے وہ ہجوم میں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ پھر کسی ستم ظریف
نے انہیں جوشِ عقیدت سے کندھوں پر اٹھالیا تاکہ ان کے
پرستار سہولت سے انہیں دیکھ کر آتشِ شوق بجھا سکیں۔ کچھ
اس ہماہمی میں ایک بے ہنگم صورت میں ان کے عزیز و اقارب،
دوست واحباب اور ان کے بے شمار پرستاران کا یہ بے پناہ
ہجوم پُل کی سیڑھیوں تک موصوف کو لے آیا۔ پھر اسٹیشن کی ڈیوڑھی
کے قریب آخری سیڑھیوں پہ انہیں ٹھہرا کر فوٹو لی گئیں۔ بڑی
مشکل سے ہجوم کو چیر کر آپ کھلے منہ کے ایک موٹر میں الٹے رُخ
بیٹھے۔ پبلک کو سلام کرتے، شکریہ ادا کرتے علامہ اقبال روڈ پر
فردوس منزل پہنچے جہاں ان کی رہائش گاہ ہے۔ وہاں ۲۱ زوردار
پٹاخوں سے عزیزوں اور محلہ والوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اگلے
روز صبح میں ایک عزیز دوست کے ہمراہ انہیں خوش آمدید کہنے
گیا۔ اس جواں ہمت، نیلی آنکھوں والے جواں سال خوبرو سے

مل کر جو خوشی حاصل ہوئی بیان سے باہر ہے۔ میں نے اگلے روز انہیں چائے کی دعوت دی جو انہوں نے کمال محبت سے منظور کرلی۔ آپ ۲۲ر اکتوبر کو ½۴ بجے بعد دوپہر اپنے والدِ بزرگوار اور برادران و عزیزان کے ہمراہ "دارالبلاغ" میں تشریف لائے جہاں قریباً پچاس گنے چنے احباب ان کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ چائے سے فارغ ہوکر میں نے ایڈریس دیتے ہوئے پہلے فقرہ میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:۔

"مسٹر فضل محمود، جناب پروفیسر غلام حسین صاحب وائس پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے صاحبزادے، لائق باپ کے لائق بیٹے اور وطنِ عزیز کے بہادر سپوت ہیں"

اس پر دوستوں نے خوب داد دی۔ دعوت ختم ہوئی۔ رات سونے کے لئے پلنگ پر دراز ہوا تو رہ رہ کر ایک خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ وہ یہ کہ فضل محمود صاحب سے کرکٹ پر کتاب لکھوائی

جائے۔ بالآخر کچھ سوچ سمجھ کر ارادہ پکا کر لیا۔ اگلے روز پھر ان سے ملا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کافی طویل گفت و شنید کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فضل محمود صاحب کتاب لکھنے کے لئے شدید مصروفیت کے باعث وقت نہ نکال سکیں گے۔ لہٰذا میں نے خاص صلاحیتوں کے حامل ایک دوست کو سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سایہ کی طرح اپنے فارغ اوقات میں فضل صاحب کے ساتھ رہیں اور انٹرویو کی صورت میں تمام حالات و کوائف بڑی تفصیل کے ساتھ معلوم کریں اور کھوج لگا کر ایسی معلومات فراہم کریں کہ پبلک انہیں معلوم کر کے پوری طرح محظوظ ہو۔ میری اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے شیخ انعام اشرف صاحب نے جس تن دہی، محنت شاقہ اور بے پایاں صبر و تحمل کا مظاہرہ ان معلومات کے فراہم کرنے میں کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے بعض حالتوں میں تو انہیں انٹرویو لینے کے لئے گھنٹوں فضل محمود صاحب کا انتظار کرنا پڑا۔

الحمد للہ کہ ہماری کوششیں بر آئیں اور ہم ان بیش قیمت

معلومات کو دلچسپ انٹرویو کی صورت میں پیش کرنے کے قابل ہوئے۔ ان اوراق کے مطالعہ سے ایک بات بڑی وضاحت سے سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کے اکثر و بیشتر جوانوں میں بفضلِ تعالیٰ وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جس سے وہ عزیزِ جہاں ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ پسندیدہ مشاغل میں پُرامید ہو کر سخت کوشش کا مسلسل اور متواتر مظاہرہ کریں اور عملِ پیہم سے اپنے فن میں کمال پیدا کر دکھائیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی قوم کے مزاج کو بالکل ٹھیک سمجھ کر فیصلہ صادر فرمایا تھا ؎

نامید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اس دلچسپ کتاب کے مطالعہ سے قارئین پر واضح ہوگا کہ اوول کے میدان میں قریباً ایک سال قبل انگلینڈ کرکٹ ٹیم کے کپتان ہٹن پر جب ہزاراں در ہزاراں خواتین و حضرات نے آسٹریلیا ٹیم سے میچ جیتنے پر ہاتھوں کو ہلا ہلا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر داد و تحسین کے پھول برسائے تھے۔ اس وقت پاکستان کا بہادر

سپوت فضل محمود وہاں تماشائیوں کی گیلری میں خاموش بیٹھا یہ
منظر دیکھ کر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ اسی
اوول کے میدان میں کپتان ہٹن کو میں شکست دوں اور یہی
پبلک کے ہاتھ جو آج ہٹن کے لئے لہرا رہے ہیں میرے لئے
لہرائیں۔ یہ خیال اس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو کر رہ گیا۔
وہ ایک سال تک انتھک پریکٹس کرتا رہا۔ پھر خوش قسمتی اور
حسنِ اتّفاق سے وہ وقت بھی آپہنچا جب اسی اوول کے میدان
میں وہی کپتان ہٹن اس کے سامنے بیٹ لئے کھڑا تھا۔ تمام
آرزوئیں صورتِ سوال فضل محمود کے سامنے رقص کرنے لگیں اور
وہ فعالی جوش سے بھر گیا۔ پھر کیا تھا مُوڈ کی حالت میں کمالِ فن
کا مظاہرہ کرتے ہوئے برطانوی مبصر لارڈ کابہم کے الفاظ میں دیکھتے
ہی دیکھتے فضل محمود کی عظیم باؤلنگ نے انگلستان کی بیٹنگ کی
کمر توڑ دی۔ سر پل ہم وارنر نے بھی اس فتح کا سہرا فضل محمود ہی کے
سر باندھا ہے۔ اس فتح کے بعد کپتان ہٹن سرنگوں ہو کر پبلک
سے نکل جاتا ہے اور اسی مقام پر جہاں ہٹن نے پبلک سے ایک

سال قبل داد وصول کی تھی فضل محمود بھی ہزار ہا لوگوں سے اپنا ہاتھ لہرا لہرا کر جوش اور انتہائی خوشی کے عالم میں داد و تحسین وصول کرتا ہے،

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں
آب خود می گیرم از سنگِ گراں

(اقبالؒ)

آخر میں جناب شیخ خورشید احمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے فضل محمود صاحب کو وقتاً فوقتاً انٹرویو کے سلسلہ میں ہمارے نمائندہ سے تعاون کرنے پر آمادہ کرنے میں مدد دی۔

امید ہے کہ عام پبلک اور بالخصوص کرکٹ کے شائقین اس مفید اور دلچسپ کتاب کو کامیاب اور مقبول بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کیلئے

۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء

(خواجہ) بدر الاسلام فروغی
ڈائریکٹر دار البلاغ۔ لاہور

رات کے ٹھیک پونے نو بجے پاکستان میل رینگتی ہوئی چار نمبر پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ اور فضل ڈبے کے دروازے پر کھڑا اپنا دایاں ہاتھ لہرا لہرا کر ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح اب بھی دلکش مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اور چہرے پر ناقابلِ شکست اعتماد کے آثار نمایاں تھے۔ وہ حسبِ معمول ایک غیر متزلزل یقین کے ساتھ اپنی نئی امتحان گاہ کی جانب رواں تھا۔ اس کے بشاش چہرے پر تفکّر کی ادنیٰ سی جھلک بھی موجود نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ امتحانات کی زد میں رہا ہے۔ ہم سب کی نظریں اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پہ مرکوز تھیں جو لحظہ بہ لحظہ دھندلاتا جا رہا تھا۔ اور چند لمحے بعد اس کے خدوخال

یارڈ کے اندھیرے میں مدغم ہو گئے .... پاکستان میل کا
برق رفتار انجن اسے ہم سے دور لے جا رہا تھا۔ کافی دور ......
پٹھانوں کے دیس پشاور میں ...... جہاں اسے سرحد کی کرکٹ
ٹیم سے میچ کھیلنا تھا ......

پلیٹ فارم کچھ عرصہ پہلے کی طرح پھر بے رونق ہونے لگا۔ اور
میں طبیعت میں ایک بوجھل پن لئے منتشر ہجوم کے ساتھ سیڑھیوں
کی طرف چل دیا۔ میرے ہمراہ خان محمد، اسلم اور خورشید صاحب
بھی تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر میں نے خورشید صاحب سے اجازت
چاہی۔ اور تانگے والوں کی عقابی نگاہوں سے بچتا بچاتا اقبال
روڈ کو ہو لیا۔

سردی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں
میں دبا لیا۔ اور کوٹ کے کالر اوپر اٹھا پتلون کی جیبوں میں ہاتھ
ڈال لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا اپنی خواب گاہ میں جا کر دم لیا۔ اور
لباس تبدیل کئے بغیر ہی خود کو سرد سرد بستر کے حوالے کر دیا ....
فضل کے جانے سے میں عجیب سی بے کیفی محسوس کر رہا تھا۔ یوں

معلوم ہوتا تھا۔ جیسے رنگین لاہور کی تمام رعنائیاں سمٹ کر اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی ہوں میں کافی رات گئے تک اس کے بارے میں سوچتا رہا...... اور اسی پژمردگی کے عالم میں نیند کی دیوی سے ہم آغوش ہو گیا.....

صبح اُٹھا۔ تو گذشتہ پندرہ روز کی مسلسل شب بیداری کے باعث جسم تکان سے چُور ہو رہا تھا۔ لہٰذا مکمل آرام کرنے کی ٹھانی۔ اور لمبی تان کر سو رہا۔ شام کو چار بجے کے قریب اٹھا۔ اور لکھنے کی میز پر بیٹھ گیا۔ تاکہ فضل کی آمد سے پیشتر وہ تمام حالات قلمبند کر لوں جو وہ پشاور جانے سے قبل بیان کر چکا تھا لیکن گھنٹہ بھر کی ناکام سعی کے بعد پھر پلنگ پر آ لیٹا۔ کیونکہ کوشش بسیار کے باوجود طبیعت مائل نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں نے لکھنے کا پروگرام ایک دن کے لئے ملتوی کر دیا۔ کلاک نے پانچ بجائے اور میں غیر شعوری طور پر ایک کسک اور بے چینی محسوس کرنے لگا۔ شاید اس لئے کہ میں کئی دنوں سے ہر شام فضل کی معیت میں گذارنے کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے بغیر ایک ایسا خلا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے

صرف اس کا قرب ہی پُر کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے جلو میں زندگی
اپنی جملہ حلاوتوں سمیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ رنج والم اور خوف د خطر
کا اس کی انجمن میں گذر نہیں۔ اس کے پاس لطیف مزاح اور ٹھوس
قہقہوں کا بے پناہ خزانہ ہے۔ وہ زندگی کے تاریک پہلوؤں پر
کبھی نہیں سوچتا۔ وہ منفی اندازِ فکر سے بالکل نا آشنا ہے۔ اس کے
لازوال اعتماد نے اسے مجسّم رجائی بنا دیا ہے۔ اس کا ذہن احساسِ شکست
سے یکسر عاری ہے اس کی نس نس میں جوانی کی حرارت ہے اس
کی گفتگو میں رس اور لہجے میں مٹھاس ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھ
کر مُردہ دل اِنسان بھی جینے کا ڈھنگ سیکھ جاتا ہے۔ آپ چاہے کتنے
ہی رنجیدہ خاطر کیوں نہ ہوں وہ یقیناً "بقول شخصے" کے عنوان سے
ایک آدھ لطیفہ سنا کر آپ کے تنِ مردہ میں زندگی کی رُوح پھونک
دے گا۔ یا بقول اس کے آپ کا دل "پشوری" کر دے گا۔ اور
پھر آپ جُوں جُوں اس کے قریب ہوتے جائیں گے۔ وہ آپ
کو نت نئی کہانیاں سنائے گا...... حقیقت سے لبریز اور
کیف آگیں کہانیاں...... اس کی زندگی کے ہر لمحے میں افسانے

بھرے پڑے ہیں...... وہ بذات خود افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ ایک مسلسل اور رنگین ناول جس کا ہر ورق "یقین محکم"۔ "عمل پیہم" "محبت فاتحِ عالم" کی زندہ جاوید تفسیر ہے....

اگلے دن لکھنے کا میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ اور مزاج کو اعتدال پر لانے کی خاطر سرِ شام پلازا کی جانب چل دیا۔ جہاں موسیقی اور مزاح سے بھرپور فلم لیٹن لَورز (Latin Lovers.) چل رہی تھی۔ تجربہ واقعی کامیاب رہا۔ کیونکہ فلم دیکھنے کے بعد جب میں گھر لوٹا تو ذہن بالکل صاف تھا۔ لہٰذا فوراً لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر تخیل کو کھلی پرواز کے لئے بیتے لمحوں کی وادیوں میں آزاد چھوڑ دیا اور چند ثانئے بعد میری نظروں کے سامنے ایک ایک منظر بالترتیب گھومنے لگا۔ اور پھر مجھے دو نومبر کی سہانی دوپہر یاد آگئی۔ جب میں پہلی مرتبہ اسے گھر سے ملنے کے لئے نکلا۔ تمام راستہ میرا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ میرا ذہن اس کی شخصیت سے متعلق متعدد ہیولے بناتا اور بگاڑتا رہا۔ لیکن کوئی واضح خاکہ تشکیل نہ

دے سکا۔ ایک بات رہ رہ کر میرے دل میں کھٹکتی تھی کہ فضل خواہ کیسا ہی اچھا انسان ہو۔ بالآخر ایک کھلاڑی ہے۔ اور کھلاڑی اور ادیب کے درمیان اتنا ہی بُعد ہے۔ جتنا کسی فلسفی اور شاعر کے درمیان۔ لہٰذا دو چار ملاقاتوں کے بعد نتیجہ کہیں مایوس کن برآمد نہ ہو۔ میں لنچ ٹائم کے بعد صدر پولیس اسٹیشن پہنچا۔ چپراسی سے اطلاع کروائی اور دوسرے ہی لمحے پاکستان کے عظیم باؤلر فضل محمود کے مضبوط ہاتھ مجھ سے مصافحہ کر رہے تھے۔ میرا مخاطب ڈی۔ ایس۔ پی کی وردی میں ملبوس ایک صحت مند، وجیہہ اور خوبرو جوان تھا۔ نیلی آنکھوں اور حسین خدوخال کا مالک .... مردانہ حُسن کا دلکش مُرقع:

رسمی مزاج پُرسی اور تعارفی مراحل طے کرنے کے بعد بات چیت اصل موضوع کی طرف آئی۔ اور کوئی نصف گھنٹہ افہام و تفہیم میں گذر گیا دوران گفتگو مجھے یہ جان کر انتہائی مسرّت حاصل ہوئی کہ فضل محمود بہترین کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ شخصیّت کا مالک بھی ہے۔ وہ عالمگیر شہرت رکھنے کے باوجود بد دماغ نہیں۔ بلکہ حلیم الطبع، ملنسار اور قابلِ رشک اخلاق

کا حامل ہے۔ وسیع القلبی اور بلند حوصلگی اس کی فطرت کا خاصہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور صاحبِ ذوق و نظر ہے۔ مجھے اسے یہ سمجھانے میں کہ انٹرویو کس نہج پہ ہوگا۔ ذرہ برابر وقت پیش نہ آئی۔ اور وہ انٹرویو دینے پر رضامند ہو گیا۔ بشرطیکہ میری طرف سے دو باتوں کی کڑی پابندی ہو سکے۔ اولاً یہ کہ میں اس کی غیر معمولی مصروفیات کے مدِنظر شام کے بعد ہر وقت اس کے ساتھ رہوں۔ اور اگر وہ کسی دن وعدہ خلافی کر جائے تو میں سختی سے احتجاج نہ کروں۔ ثانیاً یہ کہ میں اس کی گفتگو کے اختتام تک مکمل سکوت اختیار کئے رہوں اور اگر کوئی شے وضاحت طلب ہو تو بعد میں دریافت کر دوں۔ میں نے یہ تمام شرائط بلا تامل منظور کر لیں۔ یہ سوچ کر کہ "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔" اور یہ سب معاہدے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ مزید برآں اس کی ابتدائی زندگی کے حالات سنتے وقت کسی قسم کی پوچھ گچھ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا..... چنانچہ میں روزانہ شام پانچ سے سات بجے تک کا وقت مقرر

کر کے واپس چلا آیا۔ اور اگلے روز یعنی تین نومبر کی شام کو وہ اپنے خوبصورت ڈرائینگ روم کے صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں پر نظریں جمائے اپنی عمرِ رفتہ کے منتشر اوراق کو ایک مربوط ترتیب کے ساتھ جوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آج سے تقریباً اٹھائیس برس پیشتر فروری کی ایک خوشگوار صبح کو میں نے جہانِ رنگ و بو میں آنکھ کھولی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو پتہ چلا کہ ہمارے مکان کے متصل اسلامیہ کالج ہے جہاں قبلہ والد صاحب پروفیسری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ..... بچپن کے اس دور کی اور تو کوئی ایسی یاد نہیں جو غیر معمولی ہونے کی بنا پر ذہن میں محفوظ ہو۔ ماسوا اس کے کہ سال میں ایک آدھ مرتبہ والد صاحب کی مزاجی حالت اچھی خاصی غیر ہو جایا کرتی تھی۔ اور وہ رات کو سوتے میں اچانک چلا اٹھتے۔ ......"جہانگیر کیچ کر لو .... بقا جیلانی آؤٹ کر دو .. .. وہ آؤٹ ہو گیا۔" اور پھر یکدم کروٹ بدلنے کے ساتھ ایک بلند آواز سنائی دیتی "جیت لیا میچ" اس کے بعد ان کا

تنفس معمول پر آجاتا۔ ان کے چہرے پر آسودگی کے آثار نمایاں ہو جاتے اور وہ گہری نیند سو جاتے۔ صبح بیدار ہو کر جب ہم لوگ گذشتہ شب کا قصہ سنا کر اس جذباتی ہیجان کا سبب دریافت کرتے تو ان کی زبانی معلوم ہوتا۔ کہ آج کل اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے درمیان یونیورسٹی کرکٹ فائنل میچ جاری ہیں۔ اس سارے وقوعہ کے پس منظر میں در اصل اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے مابین کرکٹ کے سلسلے میں ایک مسلسل کشمکش تھی۔ کیونکہ ہر دو کالج کرکٹ کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ والد صاحب چونکہ اسلامیہ کالج کرکٹ ٹیم کے صدر بھی تھے۔ لہٰذا اپنے کالج کی ٹیم کے وقار کو برقرار رکھنا ان کا فرضِ منصبی تھا۔ جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ دن رات کوشاں رہتے کیونکہ انہیں خود بھی کرکٹ سے دلچسپی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر کو رکا اور دوسرا سگریٹ سلگا کر پھر گویا ہوا۔۔

"والد صاحب کی اس کیفیت کے نقوش تقریباً چھ سال کی عمر میں میرے ذہن پر مرتسم ہونے شروع ہوئے۔ اور اگرچہ میں اس وقت بالکل کم سن تھا۔ اور یہ باتیں میرے لئے تقریباً ناقابلِ فہم تھیں

لیکن اس کے باوجود میرے والد میری تربیت سے غافل نہیں تھے وہ مجھے ہمیشہ زوردار لہجے میں تلقین کیا کرتے "محمود تم بڑے ہو کر باؤلر بننا اور ایک دن گورنمنٹ کالج کو اس بُری طرح شکست دینا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔"

ان دنوں میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں گذارتا۔ اور تمام دن وہیں کھیلتا۔۔۔ کودتا۔۔۔۔ رفتہ رفتہ میں کالج کے کھلاڑیوں سے اس قدر مانوس ہوگیا۔ کہ مجھے ہر فائنل میچ میں بطور (Good Luck Musket) اپنے ہمراہ لے جاتے اور میں وہ میچ انتہائی دلچسپی اور انہماک سے دیکھا کرتا۔ وقت یونہی گذرتا گیا۔ اور میرا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ جس کی ایک بڑی وجہ والد صاحب کی مسلسل تاکید اور دونوں کالجوں کی مستقل چپقلش تھی۔ جو آج بھی باقی ہے۔۔۔ چنانچہ میں اس ننھی سی عمر میں اپنا چھوٹا سا بیٹ سنبھال گیند کو ہاتھوں میں اچھالتا اپنے ہمجولیوں کو اکٹھا کر کے کبھی کسی کھلے میدان کا رخ کر لیتا۔ کبھی قریبی گلی کوچوں کا اور وہاں گھنٹوں کرکٹ کھیلنے میں مشغول رہتا۔ سب سے پہلے

میں نے والد صاحب کی ہدایت کے بموجب یہی " لگ کٹر (Leg - Cutter) جو آج میرا مخصوص اور بہترین گیند ہے۔ پھینکنے کی مشق شروع کی وہ ہمیشہ اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کرتے" محمود میری بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ لگ بریک (Leg Break) کھیلنا بیٹسمین کے لئے ایک نازک ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ اور بہت کم کھلاڑی اسے عبور کر پاتے ہیں۔ لہٰذا تم اپنی تمام تر توجہ اسی پر صرف کیا کرو۔" چنانچہ روزانہ کے اس سبق نے میرے دل میں اس گیند کے پھینکنے کا شوق پیدا کر دیا۔

اس دوران میں ہم اپنا پہلا مکان چھوڑ کر موجودہ جائے رہائش واقع اقبال روڈ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور مجھے کینیرڈ گرلز ہائی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں لڑکوں کو صرف ففتھ اسٹینڈرڈ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ اسکول چونکہ لڑکیوں کا ہے۔ لہٰذا یہاں کرکٹ کھیلنے کا کوئی انتظام نہیں۔ بہر حال میں نے اس کمی کو جلد ہی پورا کر لیا۔ یعنی میں اسکول سے فارغ ہونے کے بعد اپنی چھوٹی سی سائیکل پکڑ سیدھا اسلامیہ

کالج پہنچ کر دم لینا۔ اور وہاں کی ٹیم کے کھلاڑیوں کے ساتھ مِل جُل کر کرکٹ کھیلنا......

میں اب بھی خوش تھا۔ کہ چلو ذرا سی تکلیف کے بدلے مشق کرنے کا موقع تو میسّر آ جاتا ہے لیکن شومیٔ قسمت سے میری یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ ۱۹۳۲ء میں پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد مجھے کینیرڈ سے بھی رخصت ہونا پڑا۔ اور پھر مجھے اسلامیہ ہائی سکول لاہور چھاؤنی میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں کرکٹ کی ٹیم تو بے شک موجود تھی۔ مگر صرف برائے نام۔ کیونکہ دیگر سکولوں کے مقابلے میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی لہٰذا ایسی صورت میں میرے لئے مشق کے متعلق سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر میں نے عاجز آ کر "پنجاب کرکٹ کلب" میں شرکت کر لی جس کے ممبران ہمارے گھر کے قریب ہی محلہ "بیبیاں پاک دامن" کے ایک میدان میں مشق کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ کلب میں میری شمولیت کے فوراً ہی بعد ہمارا میچ میڈیکل کالج کے ساتھ ہوا۔ جس میں میں نے مخالف ٹیم کے چھ کھلاڑی صرف آٹھ رنز میں آؤٹ کر دیئے...... اس کامیابی کے پیشِ نظر کلب کے

تمام ممبران کا خیال تھا۔ کہ اگر میرا شوق اور مشق بدستور قائم رہے تو میں ایک نہ ایک دن ہندوستان کی ٹیم میں ضرور شامل کر لیا جاؤنگا۔ دوستوں کی اس رائے اور میری کامرانی نے میرے ارادوں کو نہ صرف تقویت دی۔ بلکہ میری آتشِ شوق کو تیز تر کر دیا۔ یہاں تک کہ میں اسکول سے چھٹی ہونے پر سیدھا کلب جاتا۔ اور مالی کے ساتھ مل کر خود میٹنگ (Metting) اور نیٹ (Net) لگاتا اور اکیلے ہی نیٹ میں گیند پھینکنا شروع کر دیتا۔ دیگر ممبران کی آمد سے قبل میں روزانہ ایک گھنٹہ گیند اندازی کرتا۔ اور اس کوشش میں رہتا کہ گیند ہر مرتبہ ٹھیک وکٹ کے نشانے پہ بیٹھے۔

میٹرک کے امتحان تک میں برابر اس ٹیم میں کھیلتا رہا۔ اور مشق لگاتار جاری رکھی۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی دن ہوگا۔ کہ میں نے مشق کرنے سے گریز کیا ہو۔ اس زمانے میں صغر سنی کے باعث گو میرے بازوؤں میں اتنی طاقت و توانائی نہیں تھی۔ کہ میں گیند تیزی کے ساتھ پھینک سکتا۔ پھر بھی مسلسل مشق کی وجہ سے میری گیند پھینکنے کی لنگتھ (Length) پہلے کی نسبت بدرجہا بہتر ہو چکی تھی۔ اور میں کافی

اچھی طرح لیگ بریک (Leg Break.) کرنے لگ گیا تھا۔

"۱۹۴۰ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ اور معاً اس کی نظر رسٹ واچ پر پڑ گئی۔ "انعام صاحب" اس نے کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا..." فرمائیے" میں نے پیڈ پہ بھاگتی ہوئی پنسل کو بمشکل قابو میں لاتے ہوئے جواب دیا۔ "سات بج چکے ہیں"... "لیکن فقرہ تو مکمل کر وا دیجیے" مجھے اس یک لخت خاتمے سے سخت کوفت ہوئی۔ "اوں ہوں" اس نے مسکراتے ہوئے دائیں بائیں سر ہلا دیا... "وہ کیوں" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "(Suspence) جاتا رہے گا" اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے.... میں نے پیڈ سنبھالا اور رخصت ہونے کے لئے اٹھا.... تو فضل بولا "آج سے ایک اور ڈیوٹی آپ کے ذمے ہے"... "کہیے" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دریافت کیا...... "آیندہ ہر نشست میں پہلے مجھے پچھلی قسط کے آخری الفاظ سنا دیا کیجیے گا۔ تاکہ میری یادداشت تازہ ہو جائے" "بہت خوب" اور میں مصافحہ کرنے کے بعد گھر چلا آیا.....

اگلے روز یعنی چار نومبر کو میں ٹھیک پانچ بجے اس کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا اُسے گذشتہ نشست میں لکھی ہوئی قسط کا آخری جملہ سنا رہا تھا "میٹرک پاس کرنے کے بعد" اور میں نے یہ الفاظ بول کر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ "ہوُں" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں ...... اور کشادہ پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں ..... اور اس کا ذہن عہد گم گشتہ کی یادوں کے چمن زاروں کی سیر کرنے لگا۔

"میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔" اس نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں تقریباً تیرہ برس کا تھا چنانچہ جب میں نے پروفیسر صاحبان کو بتایا کہ میں کرکٹ کا ایک اچھا خاصا کھلاڑی ہوں۔ تو وہ مسکرا دیئے اور کسی کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ بلکہ حوصلہ افزائی کی بجائے ہمارے انگلش کے پروفیسر مسٹر ایچ اے خاں نے مجھے انتہائی خلوص سے مشورہ دیا کہ میں دو چار سال آرام کر کے کالج کی زندگی اختیار کروں۔ کیونکہ میری عمر بہت کم تھی۔ اسی طرح جب میں نے کالج کی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونا چاہا تو وہی مشکل درپیش

آئی ۔ اور ان لوگوں نے مجھے ٹیم میں شامل کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ مجھے اب بھی فقط مشق پر ہی اکتفا کرنا پڑی ۔ اور میں نے کالج کی فرسٹ الیون کے ساتھ روزانہ پریکٹس شروع کر دی اور ہمیشہ باؤلنگ کو ترجیح دی ۔ کچھ عرصہ بعد جب اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج کے درمیان میچ ہوا تو مجھے ریزرو میں رکھ لیا گیا ۔ میں نے وہ میچ گہرے اشتیاق کے ساتھ دیکھا ۔ اور اختتام پر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ میدان اسلامیہ کالج کے ہاتھ رہا ۔ ۔ ۔ ۔

اسلامیہ کالج کی ٹیم اس وقت پنجاب کی بہترین ٹیموں میں شمار ہوتی تھی اور اس کے نو کھلاڑی صوبائی ٹیم میں بھی نمائندگی کرتے تھے ۔ ان دنوں اسلامیہ کالج کی ٹیم میں کھیلنا نہ صرف مشکل بلکہ باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا ۔ کیونکہ اس ٹیم میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے کھلاڑی کا صوبائی ٹیم کے لیے منتخب ہونا اور رانجی ٹرافی میں حصّہ لے سکنا یقینی امر تھا ۔ چنانچہ اس ساری معلومات کے بعد میرے دل میں کرکٹ کا شوق اس درجہ بڑھا کہ میں کالج سے چھٹی کے بعد وہیں کپڑے تبدیل کر کے مشق

شروع کر دیا کرتا۔ اور شام تک کھیلتا رہتا۔ . . . .

خوش قسمتی سے مجھے اگلے سال یعنی ۱۹۴۱ء میں فرسٹ الیون میں حصہ لینے کا موقع مل گیا۔ اور میں نے پہلی بار ہی انٹر کالج فائنل یعنی گورنمنٹ کالج کے خلاف کھیلتے ہوئے تیرہ رنز میں پانچ کھلاڑی آؤٹ کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ او یوں میرے والد صاحب کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی مجھے بھی اپنی محنت اور کامیابی کا پھل جلد ہی مل گیا۔ اور مجھے اسی سال پنجاب یونیورسٹی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا جہاں میں نے بدستور اپنی ساکھ کو قائم رکھا! اور ایک میچ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے چار کھلاڑیوں کو صرف بیس رنز بنانے کی مہلت دی۔

میں اسی طرح مختلف میچوں میں شرکت کرتا رہا۔ اور مشق لگاتار جاری رکھی حتےٰ کہ ۱۹۴۲ء میں کرکٹ سیزن ختم ہونے پر انٹرمیڈیٹ کا امتحان سر پر آ پہنچا۔ لہٰذا میں نے اپنی ساری توجہ امتحان کی تیاری میں صرف کر دی اگرچہ میں امتیازی نمبر لے کر پاس نہ ہو سکا۔ پھر بھی مجھے اس بات کی خوشی تھی۔ کہ میں نے والدین کو مایوس نہیں کیا۔ اور کرکٹ

کے علاوہ میں اپنے دیگر فرائض بھی خوب اچھی طرح سرانجام دے رہا ہوں۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں مجھے کالج کی ٹیم کا سیکرٹری چن لیا گیا۔ اور یونیورسٹی کی ٹیم میں بھی میرا انتخاب بڑی آسانی سے ہو گیا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میں اتنی ساری مسرتیں اپنے دامن میں سمیٹ سکوں مجھے ملیریا کا شدید حملہ ہوا۔ اور دورہ اتنا خراب ہو گیا کہ کرکٹ کی پریکٹس جاری رکھنی ناممکن ہو گئی۔ تھوڑی مدت کے بعد مجھے اسی حالت میں کالج اور یونیورسٹی ٹیم کی طرف سے کھیلنا پڑا۔ لیکن حددرجہ نقاہت کے باعث مجھے کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں ملیریا کا زور اور بڑھا۔ اور اب کے ڈاکٹر صاحبان کی متفقہ رائے تھی۔ کہ میں کم از کم ایک سال کے لئے کرکٹ پریکٹس مطلق چھوڑ دوں۔ مجھے یہ مخلصانہ طبی مشورہ سن کر سخت اذیت ہوئی۔ کیونکہ کرکٹ سے اتنی طویل جدائی مجھے ہرگز گوارا نہ تھی۔ لیکن قریب تھا کہ میں ڈاکٹروں کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر خود کو بستر علالت کی نظر کر دیتا۔ کہ ہمارے کالج کے پروفیسر اور پڑوسی مرزا عبدالحمید بیگ

صاحب کی ہدایات نے اعجازِ مسیحا کا کام کیا۔ پروفیسر صاحب موصوف "پنجاب ہائیکنگ اینڈ ماؤنٹری" کلب کے صدر تھے اور قدرتی طریقہ علاج کے قائل۔ انہوں نے مجھے چھ سات امریکی ہیلتھ میگزین دیئے جن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے روزانہ سیر، مناسب ورزش اور سادہ غذا کے ساتھ ساتھ پہلے سے دگنی کرکٹ پریکٹس اور پیرا کی کو بھی اپنا معمول بنا لیا۔ اور ایک قلیل عرصہ کے بعد یعنی ۱۹۴۴ء کے موسم گرما میں بالکل صحت یاب اور قابلِ رشک حد تک تندرست و توانا ہو گیا۔ اس وقت میری قوت اور توانائی کا یہ عالم تھا کہ گرمیوں کے بعد جب کرکٹ سیزن شروع ہوا تو میں صبح سے شام تک متواتر گیند اندازی کرنے کے باوجود ذرا سی تکان محسوس نہ کرتا۔

"بہت خوب" میں نے چپکے سے سلسلۂ کلام کی داغ بیل ڈال دی کیونکہ مستقل زباں بندی میرے لئے اچھی خاصی اذیت کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اور فضل کو احساس تک نہ ہوا کہ اس کی عائد کردہ پابندیوں میں سے ایک کا گلا گھونٹا جا چکا ہے۔ اور وہ اپنے خیالات میں مستغرق بولتا چلا گیا۔ "سنہ ۱۹۴۴ء میں اسلامیہ کالج کرکٹ ٹیم

نے ایک بار پھر گورنمنٹ کالج کو پسپا کر دیا۔ میں نے اس میچ میں یکے بعد دیگرے ایک سو چوبیس اوور کیے اور تقریباً ایک سو رنز کے عوض گیارہ وکٹیں حاصل کیں۔ انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی کا میچ بنارس یونیورسٹی سے ہوا جس میں میں نے مخالف ٹیم کے چھ کھلاڑیوں کو صرف چودہ رنز بنانے کے بعد آرام گاہ کی جانب بھیج دیا۔ اور ایک نیا یونیورسٹی ریکارڈ قائم کیا۔ اس صلے میں مجھے اسی سال یونیورسٹی کا بہترین باؤلر قرار دیا گیا۔ اور میں نارورن انڈیا کرکٹ ایسوسی ایشن میں بطور باؤلر منتخب ہو گیا۔ میری اس ٹیم میں شمولیت ہندوستان کی ٹیم میں آنے کی پہلی کڑی تھی۔ حسنِ اتفاق سے تھوڑی ہی دیر کے بعد ہمارا میچ جنوبی پنجاب کرکٹ ایسوسی ایشن کے ساتھ پٹیالہ میں ہونا طے پایا۔ اور اس طرح میری رانجی ٹرافی میں حصّہ لینے کی دلی تمنا بھی بر آئی۔

اُس وقت نارورن انڈیا کرکٹ ایسوسی ایشن کے کپتان کل ہند ٹیم کے سابق رکن ڈاکٹر جہانگیر خاں تھے اور جنوبی پنجاب والوں کی قیادت مہاراجہ پٹیالہ کے ذمّے تھی۔ جن کی ٹیم میں لالہ امرناتھ ایسے

نامور اور کہنہ مشق کھلاڑی موجود تھے اور جنہیں اس وقت ہندوستان کا
افضل ترین بیٹسمین تصور کیا جاتا تھا چنانچہ تاریخ مقررہ پر پٹیالہ گراؤنڈ
میں کھیل کا آغاز ہوا اور ٹاس نے جنوبی پنجاب والوں کا ساتھ دیا۔
اُن کی طرف سے بیٹنگ کرنے کیلئے میدان میں امرناتھ نمودار ہوئے
اور آتے ہی ہٹ پہ ہٹ لگانی شروع کر دی اور ایک قلیل وقفے
میں تیس رنز بنا ڈالیں۔ ڈاکٹر جہانگیر خاں نے جب کھیل کا رُخ بدلتے
دیکھا تو مجھے باؤلنگ کرنے کی دعوت دی۔ اور دوسرے لمحے میں دھڑکتے
دل سے امرناتھ کے مدِمقابل قسمت آزمائی کے لئے تیار کھڑا تھا۔
میں نے کانپتے ہاتھوں میں گیند مضبوطی سے پکڑ کر جب اسٹارٹ لیا
تو میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا
ہو رہے تھے۔ ذہن میں حوصلہ شکن خیالات جنم لے رہے تھے۔ اور
سامنے بین الاقوامی شہرت کا مالک اور ہندوستان کا صفِ اوّل
کا بیٹسمین لالہ امرناتھ ایک عجیب فاتحانہ شان سے اپنے مخصوص
انداز میں کھڑا بیٹ کو بار بار زمین پر مار رہا تھا۔ اور اس انتظار میں
تھا کہ میں کب گیند پھینکوں اور وہ اسے پیٹ کر اپنی عدیم المثال

چابکدستی کا مظاہرہ کرے۔ مجھے یہ ماننے میں کوئی تامّل نہیں کہ میں
اس سے حد درجہ متاثر تھا اور مجھے بوجہ کم عمری کے بھی اس کے سامنے
کھیلتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے دل کڑا کیا۔
اور پورے اعتماد کے ساتھ پہلی گیند پھینک ہی دی۔ گیند کا امرناتھ
کے پاس پہنچنا تھا کہ اس نے ایک دندان شکن ہٹ لگائی اور کور
پوائینٹ (Cover Point) پہ کھڑے ہندوستان کے
شہرت یافتہ فیلڈر گل محمدؒ نے کمال سُرعت سے گیند کو روک لیا۔
میں نے امرناتھ کو اسی طرز کی چار گیندیں کھلائیں لیکن وہ ہر مرتبہ
پہلے کی نسبت زیادہ بے رحمی سے پیش آیا۔ اس وقت اگر میں
ذرا بھی پست ہمتی سے کام لیتا تو بہت ممکن تھا کہ اس شکست
کا احساس مجھے عمر بھر کے لئے قعرِ گمنامی میں دفن کر دیتا۔ لیکن میں
نے پانچویں گیند کو پھینکنے سے قبل اپنی قوتِ ارادی کو اور مضبوط کیا
اور پھر ہمیشہ کی طرح ایک غیر متزلزل یقین کے ساتھ آگے بڑھا۔
لحظہ بھر کے لیے میرا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور چند ثانیے بعد گیند امرناتھ
کے بیٹ کو چھوتی ہوئی ڈاکٹر جہانگیر خاں کے ہاتھ میں تھی۔ جو گیند

کو بہ آسانی کیچ کر چکے تھے۔ گرد و پیش کی فضا تالیوں کے شور اور

Well Done Fazal Mahmood.

کے نعروں سے گونج اٹھی اور فرطِ مسرّت سے میرا ول بلیوں اچھلنے لگا
حالانکہ وکٹ فقط ایک جیتی تھی۔ مگر وہ وکٹ فخرِ ہند لالہ امرناتھ کی تھی
جسے سترہ سال کے ایک نو آموز اور کمسن کھلاڑی نے اپنی ان تھک
جدّ و جہد کے بعد حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر جہانگیر خاں نے یہ
کہہ کر مجھے بولنگ سے تبدیل کر دیا۔ کہ فضل محمود تمہارے ذمے جو
فرض تھا تم نے ادا کر دیا۔ اور میچ پھر سے شروع ہو گیا۔ میچ کے
اختتام پر گو جیت ہماری ٹیم کی ہوئی لیکن صرف تین رنز کی ناقابلِ
ذکر اکثریت سے ۔۔۔ بہرحال میرا یہ پہلا رانجی ٹرافی میچ ہزاروں
تماشائیوں کے منتشر ہجوم کے ساتھ بخیر و عافیت تمام ہوا اور
ہم سب ہنسی خوشی گھروں کو لوٹے۔"

"ہاڈی" اس نے ایک گرجدار ہانک لگائی۔ اور میں اس
اچانک حادثے سے واقعی ٹھٹھک گیا ۔۔۔ میں ابھی اسی ادھیڑ بن
میں تھا کہ بغلی کمرے سے اس کا ملازم ہادی برآمد ہوا اور اس سے

پیشتر کہ وہ کچھ دریافت کرتا فضل نے نادر شاہی حکم سنا دیا۔" اندر سے ہمارا براؤن والا سوٹ لاؤ۔ ایک دم جلدی ۔۔۔ ہاں۔" اور مجھے اس دن پتہ چلا کہ حضور جس وقت اچھے مُوڈ میں ہوں تو انگریزی لہجے میں اردو بولتے ہیں ۔۔۔۔ بالکل بابا لوگوں کی طرح ۔۔۔۔" کہاں کے ارادے ہیں" میں نے فائل سنبھالتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔" ایک دعوت میں جانا ہے۔" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔" تو آج کل آپ مُرغبازی پہ کمربستہ ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔" ولایت سے واپس آکر تو اتنے مرغ کھائے ہیں کہ بقول شخصے میں خود مرغا بن گیا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔" آپ بھی چلئے گا؟" "بندے کو تو معذور ہی سمجھیے۔" میں نے رخصت ہونے والے انداز میں کہا۔" ارے کیا حرج ہے آپ بھی چل کر ایک آدھ ٹانگ کھا لیجیے۔" اس کے ہونٹوں پہ شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔" میرے حصّہ کی آپ ہی کھا لیجیے گا۔" میں نے مخلصانہ پیشکش کی اور ہم دونوں بیساختہ ہنس پڑے۔

دوسرے دن پہنچا تو حضرت صوفی پرور از "شامِ غم کی قسم،

آج غمگیں ہیں ہم" کا الاپ کرنے میں مشغول تھے۔" حاضر ہو سکتا ہوں" میں نے دہلیز پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔" بلا تکلف" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ میں نے پتلون کو کریز سے پکڑ کر اونچا کیا اور اُس کے بالمقابل بیٹھ گیا۔" چائے پی جیئے گا۔" اس نے بڑے خلوص سے پوچھا۔" آپ مہمانوں کو چائے بھی پلایا کرتے ہیں" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کچوکا لگایا...... آدمی بلا کا ذہین ہے وہ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔" انعام صاحب" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔" معذرت کا میں قائل نہیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ لیکن یقین مانیئے کہ مجھے آج کل اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں" اس نے عذر پیش کیا۔" صبح دفتر میں شام کو آپ کے ساتھ اور رات کو متعدد دعوتوں میں...... اگر میں ان تقریبات میں شرکت نہ کروں تو بددماغ اور خود پسند کہلاؤں۔ حالانکہ ان مصروفیات کی بدولت مجھے کرکٹ پریکٹس کا موقع بھی نہیں مل رہا۔ اور اگر یہ آج کا ادول ہیرو کل کو کسی میچ میں اچھی طرح نہ کھیل سکا تو میرے یہی کرم فرما لعن طعن میں پیش پیش ہوں گے۔ بس اسی جگہ میں کچھ یاد

نہیں رہتا۔ بہرحال آئیندہ محتاط رہنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے اپنی بے بسی کی وضاحت میں ایک لمبا لیکچر جھاڑ ڈالا اور ساتھ ہی گھر کی ملازمہ بختاں کو چائے بنانے کے لئے کہہ دیا۔ "ہاں جی" اس نے ہر طرف سے فراغت پا کر نعرہ لگایا۔ "کل آپ پٹیالے والا میچ جیت کر ہنسی خوشی گھر کو لوٹے تھے"۔ میں نے اس ہاں جی کا مطلب سمجھتے ہوئے فوراً جواب دیا۔ اور جھٹ سے پنسل نکال ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں اور چند ثانئے خاموش رہنے کے بعد اپنی کہانی کا آغاز کر دیا۔ "پٹیالے میں میچ کھیلنے کے بعد اسی سال یعنی ۴۴ء۱۹ میں ہمارا دوسرا رانجی ٹرافی میچ یعنی ...... سیمی فائینل ایسٹ انڈیا اسٹیٹس کے ساتھ راجکوٹ کاٹھیاواڑ میں ہوا۔ اور اگرچہ اس میچ میں ناردرن انڈیا کرکٹ ایسوسی ایشن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم میرے غیر معمولی طور پر اچھے کھیل کے مظاہرے کی وجہ سے ٹیم میں میری ساکھ پہلے سے کہیں مضبوط ہو گئی۔ میں نے اس میچ کی پہلی اننگز میں چوالیس ۴۴ رنز میں پانچ کھلاڑی آؤٹ کئے اور دوسری اننگز میں تقریباً پچاس

رنز میں چھ۔ اس میچ کے بعد میں ہندوستان کے کرکٹ کے شائقین سے خوب اچھی طرح متعارف ہوگیا۔ اور اب مجھے کل ہند کرکٹ ٹیم میں اپنی رکنیت کی تھوڑی بہت امید ہوگئی۔ ۱۹۴۴ء کا کرکٹ سیزن میرے لئے بے حد کامیاب رہا۔ اور پیہم کامرانیاں کرکٹ سے میری دلچسپی میں روزافزوں اضافہ کرتی چلی گئیں۔ کرکٹ سے عشق تو مجھے پہلے ہی تھا اب کیفیت جنوں کی حد تک پہنچ گئی اور میں دن رات اسی دھن میں رہنے لگا۔ اسی دوران میں بی۔ اے کا امتحان بھی مزاج پرسی کو آن نازل ہوا۔ اور میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا فوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ یکسوئی کے ساتھ دن رات پڑھنا شروع کر دیا اور آخر کار شبانہ روز کاوشوں کا نتیجہ مطلوبہ ڈگری کی صورت میں برآمد ہوگیا۔

۱۹۴۴ء کا زریں دور آیا تو میں ہر طرف سے فراغت پا چکا تھا چنانچہ ۱۹۴۵ کے رانجی ٹرافی میچ میں نے نہایت دلجمعی اور کامیابی کے ساتھ کھیلے۔ اسی سال ہندوستان کے کرکٹ بورڈ نے ہندوستان کو بلحاظ کرکٹ چار منطقوں میں تقسیم کر دیا۔ اور مجھے شمالی منطقہ کی نمائندگی

سپرد کی گئی جو انجمن ہائے کرکٹ، جنوبی پنجاب، شمالی ہند، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ پر مشتمل تھا۔ اس تقسیم سے کرکٹ بورڈ کو کل ہند کرکٹ ٹیم کی از سر نو تشکیل مقصود تھی۔ تاکہ چاروں منطقوں کے باہم میچ کرانے کے بعد ہر منطقہ سے کامیاب اور بہترین کھلاڑی منتخب کیے جا سکیں۔ اور پھر انہیں آئندہ سال یعنی ۱۹۴۶ء میں انگلستان کا دورہ کرنے والی ٹیم میں شامل کر لیا جائے۔ مختصراً یہ کہ اس تمام ردّوبدل کے بعد زونل ٹورنامنٹ کے میچ مقرر کیے گئے۔ اور ساتھ ہی کرکٹ بورڈ نے ایک اعلان میں کہا۔ کہ یہ تمام میچ ٹرائل میچ متصوّر ہوں گے۔ اور انگلستان بھیجی جانے والی ٹیم کے کھلاڑیوں کا انتخاب کرتے وقت حالیہ میچوں کے نتائج پیشِ نظر رکھے جائیں گے۔

"چائے لے آؤں جی۔" ہادی نے مخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "لے آؤ" فضل کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے۔ غالباً اسے ہادی کا غیر متوقع طور پر خلل انداز ہونا ناگوار گذرا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں آپ کو میچ کا نظارہ کرانے لگا تھا اور اوپر سے چائے آ ٹپکی۔" اس نے بُرا سا منہ بنا لیا۔ "خیر اب چائے پی لیں۔" اُس نے نکٹائی کی گرہ کو درست کرتے

ہوئے کہا۔ اور اتنے میں چائے آگئی۔ ہم نے جلدی جلدی چائے پی اور سگرٹ سُلگا کر پھر تیار ہو گئے۔ "ہاں جی" اس نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا اور دوبارہ موڈ پیدا کرنے کے لئے لمبے لمبے کش لینے شروع کر دیئے۔ "اور انگلستان بھیجی جانے والی ٹیم کے کھلاڑیوں کا انتخاب کرتے وقت حالیہ میچوں کے نتائج پیش نظر رکھّے جائیں گے۔" میں نے ابھی ابھی لکھّا ہوا آخری فقرہ دوہرایا۔

"ہوں" وہ دھوئیں کی ایک لمبی لکیر بناتے ہوئے بولا۔ اور پھر سے داستان شروع کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہماری ٹیم یعنی شمالی منطقے کا پہلا میچ مشرقی منطقہ والوں کے ساتھ بمبئی میں ہونا قرار پایا۔ ہماری ٹیم کے یہ قائد کل ہند کرکٹ ٹیم کے منتخب شدہ کپتان نواب پٹودی تھے۔ اور مشرقی منطقے کی رہبری ہندوستان کے نامور اور مشّاق کھلاڑی سی۔ کے نائیڈو کے ذمّہ تھی۔ چنانچہ میچ کا دن آیا اور کھیل کے آغاز سے پیشتر پٹیالہ والے میچ کی طرح میری طبیعت پھر ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ کچھ تو اس لئے کہ مجھے زندگی میں پہلی بار تیس ہزار لوگوں کے

ہجوم کے سامنے کھیلنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ اور دوسرے مخالف ٹیم میں سی۔ کے نائیڈو کے علاوہ ان کے بھائی سی۔ ایس نائیڈو اور مشتاق علی ایسے کھلاڑیوں کا وجود ہی ایک نوعمر کھلاڑی کے ہوش ٹھکانے لگا دینے کے لئے کافی تھا۔ یہ وہ کھلاڑی تھے۔ جن کی قابلیت مسلّمہ اور شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بہر حال کھیل کا آغاز ہوا اور قرعۂ اندازی کے بعد کھیل ہمارے فیلڈر سے شروع ہوا۔ ادھر سے مشتاق علی اور سمبا لکر بیٹنگ کے لئے آئے۔ اور ہماری طرف سے امرناتھ اور کاردار بولنگ کو نکلے۔ کاردار نے بمشکل تین اوور کئے تھے کہ ہمارے کیپٹن نواب پٹودی نے ان کے بجائے مجھے بولنگ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے پہلا اوور میڈن کیا یعنی اس دوران میں کوئی رنز نہ بنانے دیں۔ اور امرناتھ نے دوسرے اوور میں مشتاق علی کو آوٹ کر دیا۔ امرناتھ کا مشتاق علی کو آوٹ کرنا تھا۔ کہ میں نے اپنے جسم میں ایک نئی زندگی محسوس کی مجھے فوراً خیال پیدا ہوا کہ اگر امرناتھ مشتاق علی ایسے ماہر کھلاڑی کو شکست

دے سکتا ہے تو میں دیگر بیٹسمینوں سے کیوں نہیں نبٹ سکتا۔

چنانچہ میں نے قوّتِ ارادی کو مستحکم کیا اور ایک نئے اور مصمّم عزم کے ساتھ بولنگ کے لئے لپکا۔ اور آن کی آن میں مشرقی منطقے کی ساری ٹیم صرف اِکاون ۵۱ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ نتیجۃً بہترین بولنگ کا فخر مجھے اور امرناتھ کو حاصل ہوا۔ میں نے اس اننگز میں بیس ۲۰ رنز میں چار وکٹیں حاصل کیں۔ امرناتھ نے چوبیس رنز میں چار کھلاڑی آؤٹ کئے اور باقی دو کو عنائت خاں کی کوشش نے پسپا کیا۔

ہم اپنی اِننگز میں تقریباً چار سَو رنز بنا چکے تو مشرقی منطقے کی دوسری اِننگز شروع ہوئی۔ اور ان کے تمام کھلاڑی دو سو پچاس ۲۵۰ رنز بنا کر پھر آؤٹ ہو گئے۔ میں نے اس دفعہ پھر ان کے پانچ کھلاڑیوں کو کھیلنے سے محروم کر دیا۔ اس میچ میں ہندوستان کے سب انتخاب کنندگاں موجود تھے۔ اور اب میں ان کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اور مجھے قوی امید تھی کہ میں انگلستان کا دورہ کرنے والی ٹیم میں شامل کر لیا جاؤں گا لیکن کرکٹ سیزن کے اختتام پر جب اس ٹیم کے

ممبران کا چناؤ ہوا تو میں بوجہ کمسنی کے منتخب نہ ہو سکا۔ مجھے ٹیم میں شامل نہ ہو سکنے کا مطلق کوئی افسوس نہیں تھا۔ کیونکہ اس محرومی کی وجہ مجھ میں صلاحیتوں کا فقدان نہیں بلکہ صغر سنی تھی۔" آخری جملہ کہتے وقت فضل کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی اور اس کے چہرے پر ناقابل شکست اعتماد کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"بہرحال اس انتخاب کے کچھ عرصہ بعد نئی تشکیل کردہ ٹیم انگلستان روانہ ہو گئی اور میں نے حسب معمول روزانہ مشق کو اپنا شعار بنایا چنانچہ گرمیوں میں یہ ٹیم انگلستان کا دورہ کر کے واپس آ گئی اور وہاں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

ہندوستانی ٹیم کی کمزوری کو بھانپ کر کرکٹ بورڈ کے ذی فہم اربابِ اختیار کو سخت تشویش لاحق ہوئی جس کا تدارک کرنے کے لئے انہوں نے فوری قدم اٹھایا یعنی دہلی میں پانچ ٹرائل میچ مقرر کر دیئے۔ جس میں سے ایک میچ ویسٹ آف انڈیا اور انڈیا اِن انگلینڈ الیون، کے درمیان طے پایا۔ ان میچوں کے پس منظر میں بھی وہی مقصد پنہاں تھا جو زونل ٹورنامنٹ کے وقت مدِ نظر تھا

یعنی ٹیم کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا۔ کیونکہ آئندہ سال کے موسم سرما میں ہندوستانی ٹیم کو آسٹریلیا پہنچ کر کرکٹ کے جنم داتاؤں سے پالا پڑنا تھا۔ القصہ یہ میچ بھی آئے اور میں سی۔ کے نایئڈو کی زیر قیادت وجے مرچنٹ کی ٹیم "انڈیا ان انگلینڈ الیون" کے خلاف کھیلا میں نے اس میچ میں مرچنٹ کے دس کھلاڑی آؤٹ کئے اور "انڈیا ان انگلینڈ الیون" والوں کو چھ وکٹوں سے شکست کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا۔

انڈیا ان انگلینڈ الیون کا اس بری طرح ہار جانا ہندوستانی کرکٹ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ لہذا اخباری دنیا میں ہلچل مچ گئی اور ہر کس و ناکس کرکٹ بورڈ کے انتخاب کنندگان کی بصیرت پر شک و شبہ کا اظہار کرنے لگا۔ اخبارات کے لگاتار مخالف پراپیگنڈہ سے عاجز آ کر شکست خوردہ ٹیم کے کپتان وجے مرچنٹ سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے تمام اعتراضات کی تردید کرتے ہوئے ایک ہی جواب دیا۔ اس نے کہا کہ انگلینڈ میں ہندوستانی ٹیم کی ناکامی کا سبب کھلاڑیوں کی نالائقی نہیں بلکہ ٹیم میں فضل محمود کی غیر موجودگی

ہے۔ جس کا تعاون رسٹ آف انڈیا" کو حاصل ہے"۔ اور یہ کہنے کے ساتھ ہی فضل صوفے سے اٹھا اور بولا۔ "بہت ہوگئی انعام صاحب۔ اب کوئی اور بات کیجیے"۔ "اور بات تو اب کل ہی کرینگے" میں نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔ کیونکہ مسلسل لکھنے سے پپوٹے میرے بھی دکھنے لگے تھے۔ اور رخصت ہو کر گھر چلا آیا۔

شام کا جھٹپٹا تھا۔ اور ہم موٹر سائیکل پر بیٹھے تیز اور خنک ہوا کی پروا کئے بغیر گلا پھاڑ پھاڑ کر مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے موٹر سائیکل فلم کوا پریٹیو اسٹوڈیو کو پیچھے چھوڑ کر کینٹونمنٹ کی وسیع اور کشادہ سڑک کو عبور کر رہی تھی۔ سڑک کے بائیں جانب سبز و شاداب قطعات اور رنگا رنگ کے پھولوں سے لدے خوبصورت اور پر سکوت بنگلے شام کے دھندلکے میں اور بھی دلفریب معلوم ہو رہے تھے۔ فضل کی تمام تر توجہ اس وجد آور نظارے پر مرکوز ہوگئی۔ اور اسے یکدم لندن یاد آگیا۔ ... حسین اور رومان پرور لندن ...... اور پھر اس نے الزبتھ کے دار الحکومت کی کہانیاں شروع کر دیں ...... پُر اسرار اور

کیف آگیں کہانیاں .... جیسے کوئی الف لیلیٰ کا قصہ بیان کر رہا ہو...... اور چند لمحات کے لئے میں بھی گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا: "پیدل والا بین..... پٹڑی پر چلو" فضل یکایک چلایا...... اور ان نشاط انگیز بدبستی داستانوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا.... ... سامنے کوئی صاحب سڑک کے عین بیچ محوِ خرام تھے ......

اور فضل کا موڈ یک لخت بگڑ گیا: "انعام صاحب" اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے اور ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں "ہمارا ملک ابھی بہت پیچھے ہے" اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا: "یہ صاحب خاصے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں لیکن ابھی تک انہیں اتنا علم نہیں کہ پٹڑی پر چلنے سے ان کی اپنی زندگی محفوظ ہوتی ہے" اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوتے کہا: "ہائے رے لندن" اس نے ایک سرد آہ بھری "انعام صاحب" اس کی دھیمی آواز موٹر سائیکل کے کرخت شور میں مدغم ہو گئی.... "اگر وقت ساتھ دے تو ایک بار گوروں کے دیس میں ضرور جائیے" وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا: "قسم خدا کی بڑے سلجھے ہوئے لوگ ہیں...... بے حد سلجھے ہوئے...."

اس نے مجذوبوں کی طرح جھومتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ اور میرا دل دھڑکنے لگا مبادا احساس ڈی۔ایس۔پی عالمِ جذب میں بذاتِ خود کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ کیونکہ سامنے سے بھاری بھرکم ملٹری ٹرک چنگھاڑتے ہوئے شترِ بے مہار کی طرح بھاگے چلے آ رہے تھے "سائیکل والا"، فضل پھر چیخا "ایک سائیکل پہ دو مت چڑھو۔" اس نے بائیں ہاتھ سے بار بار اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا اور وہ جھلا گیا۔ "ڈیم فول۔۔۔۔۔۔ ایک دم نامعقول۔۔۔ ۔۔۔ اگر خدانخواستہ ایکسیڈنٹ ہو جائے تو ایک کی بجائے دو جانیں ضائع ہوں۔" وہ خالص انگریزی لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ "اور ملٹری آفیسر مجھے آن ڈیوٹی چاہییں"۔ اس نے غصے میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک پیچھے مڑ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ "یہ ابھی ابھی پھر سوار ہو جائیں گے"۔ اس نے پورے وثوق سے کہا اور قریب آتی ہوئی کار کا ہارن سن کر ایک طرف ہو گیا۔

دورویہ فوجی دفاتر کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ فضل نے چوک سے موٹر سائیکل موڑی اور بل بتوروں کی طرح دائیں بائیں دیکھتا صدر

کا رُخ کر لیا۔ میں اس کی نادانستہ حرکات و سکنات کا مطالعہ بنظرِ غائر
کر رہا تھا۔ اور اقبال روڈ سے صدر تک اُسے مختلف زاویوں سے
جانچتا رہا کیونکہ انسان کا ہر فعل اس کی داخلی کیفیات اور کردار کا
آئینہ دار ہوتا ہے قطع نظر دیگر اہم باتوں کے اس کا ڈرائیونگ اسٹائل
اور موٹر سائیکل کی رفتار تک میری نگاہ سے اوجھل نہ تھی۔۔۔۔ میری
نظریں وقتاً فوقتاً میٹر کے تعاقب میں رہیں۔ سوئی برابر تیس کے
ہندسے پر رُکی جو اس کی محتاط اور اعتدال پسند طبع کی غمازی کر رہی تھی۔
اس قسم کی کئی چیزوں کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ کرکٹ فضل کی نجی
زندگی پر بھی اثر انداز ہے۔ اور اس کھیل سے پیدا شدہ جملہ خصوصیات
اس کے ضمیر میں رچ بس گئی ہیں۔ حتےٰ کہ اب اس کا سراپا کرکٹ ہے
زندہ دلی، پابندیٔ نظم اور میانہ روی اس کی فطرتِ ثانیہ ہیں۔ رواداری
اور خوئے تسلیم اس کے روزمرہ میں شامل ہیں۔ اور خود اعتمادی اپنے
نقطۂ عروج پر ہے جہاں سے زوال کی حدیں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں
۔۔۔۔۔ اس نے یہ سب کچھ کھیل کے میدان میں پایا ہے۔۔۔۔ سالہا
سال کی انتھک جدوجہد کے بعد اور اب یہی ہے اس کی متاعِ حیات۔

لیکن انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ موٹر سائیکل کے دھچکے نے مجھے جھنجھوڑا اور میں فضل کے ساتھ سامنے والے مکان کی چک اُٹھا کر اندر داخل ہوا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کے صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے۔ تعارف، اور مزاج پُرسی کے تکلّفات سے فارغ ہو کر کرکٹ کی باتیں شروع ہو گئیں۔ گفتگو کا موضوع ایک میچ کا انعقاد تھا جس کا افتتاح اسلامیہ ہائی سکول صدر والے اپنے ہونہار طالب علم فضل محمود کے ہاتھوں کرانا چاہتے تھے۔ تاکہ اسکول کے بچوں میں کرکٹ کا شوق پیدا ہو...... چنانچہ چند ایک ضروری امور طے کرنے کے بعد فضل میری طرف متوجّہ ہوا اور کہنے لگا "اب ذرا نکالئے اپنی پوتھی اور تیار ہو جائیے"۔ اور میں نے پیڈ نکال کر گذشتہ نشست میں لکھا ہوا آخری فقرہ دیکھنا شروع کر دیا تاکہ اُسے مطلع کر سکوں۔

"ہاں جی" وہ حسبِ معمول بولا اور صاحبِ خانہ سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے چل دیئے۔ "آپ دہلی کے ٹرائل میچ میں" انڈیا ان انگلینڈ الیون" کو ہرا کر شکست خوردہ کپتان وجے مرچنٹ سے

خراجِ تحسین حاصل کر رہے تھے۔" میں نے صفحے پر ۶ نومبر کی تاریخ رقم کرتے ہوئے فقرے کی بجائے اقتباس ہی بیان کر دیا۔ "ہوں" اس نے صوفے پر نیم دراز ہو کر کہا اور کتابِ زندگی کے ابتدائی ابواب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

"دہلی کے ٹرائل میچ کھیل کر میں لاہور چلا آیا۔" وہ چھت پر نظریں جمائے بولا۔ "لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد مجھے پھر لاہور کی گلیوں کو ایک طویل عرصہ کے لئے خیرباد کہہ کر بنارس جانا پڑا...... جہاں مجھے بنارس یونیورسٹی کے خلاف قسمت آزمائی کرنی تھی۔ اس میچ میں قیادت کا بوجھ بھی میرے کندھوں پر تھا۔ کیونکہ اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں میرا تقرر بطور کپتان ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس میچ میں بھی جیت ہماری ٹیم کی ہوئی اور میں بنارس سے فارغ ہو کر سیدھا کلکتہ پہنچا تاکہ "ریسٹ آف انڈیا" کی طرف سے "انڈیا ان انگلینڈ الیون" کے مدمقابل کھیلوں۔" وہ تھوڑی دیر کو رکا اور سگریٹ سلگا کر پھر گویا ہوا۔ "اگرچہ یہ میچ یکم جنوری ۱۹۴۷ کو شروع ہونا تھا لیکن میری متجسس اور دور اندیش طبع نے مجھے مقررہ تاریخ

سے پانچ یوم قبل یعنی ستائیس دسمبر ۱۹۴۶ء کو کلکتہ کی سرزمین پر پہنچا دیا۔ اتنے سارے تردد سے مجھے فقط اس ان دیکھی پچ اور وکٹوں سے مانوس ہونا مقصود تھا جن سے مجھے پانچ روز بعد سابقہ پڑنا تھا۔ تاکہ کھیل والے دن نئی جگہ کے باعث میرے کھیلنے کے انداز میں فرق نہ آئے۔ اور مجھے شکست سے دوچار نہ ہونا پڑے اس نے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا ''اس میچ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے کے لئے میں سوچ کر تو بہت کچھ گیا تھا لیکن ہوا اس کے برعکس'' ''وہ کیا'' میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے پوچھا ''میرے کلکتہ پہنچنے کی دیر تھی کہ کالج کے چند دیرینہ ساتھیوں نے اطلاع پا کر میری جائے رہائش ''براڈوے ہوٹل'' پر دھاوا بول دیا۔ اور لگے سیر و تفریح پر اکسانے۔ دوستوں کے مسلسل اصرار پر میں بھی متزلزل ہو گیا۔ کیونکہ ایک تو کلکتہ ویسے ہی رنگینیوں کا مرکز اور پھر کرسمس کے ایام کا کلکتہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ بازار میں نکلے تو چچا غالب یاد آگئے جنہوں نے کہا تھا۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے شیریں وتازہ کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب وگوارا کہ ہائے ہائے

اور یہ کہتے کہتے فضل پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اِدھر اُدھر سر ہلانے لگا۔" سارا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ سڑکوں پر اس قدر ہجوم کہ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ نمائش گاہوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بچے۔ بوڑھے۔ جوان سبھی خوش و خرم نظر آ رہے تھے اور مختلف طریقوں سے اپنا دل بہلانے میں مشغول تھے۔ ہم بھی اور لوگوں کی طرح ان ہنگاموں میں برابر شریک تھے اور سیر کرتے چلے جا رہے تھے کہ ہم میں سے کسی صاحب نے گھوڑدوڑ دیکھنے کی تجویز پیش کی اور ساری چنڈال چوکڑی ریس کورس پہنچ گئی۔ ریس کورس کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ ہزاروں تماشائی اپنی اپنی قسمت آزمانے کے لئے داؤ پر داؤ لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر یہ نظارہ دیکھنے کے بعد میرے دل میں بھی گدگدی ہونے لگی۔ اور میں بھی جھٹ سے ٹکٹ خرید اپنے انجام کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت تو میں اسے خوش قسمتی سمجھا لیکن تھی میری بدبختی کہ میں ایک

قلیل عرصے میں مبلغ آٹھ سو روپے جیت گیا اور جیت کے نشے میں سرشار کافی رات گئے ہوٹل لوٹا۔ میری زندگی میں یہ پہلا دن تھا کہ میں کرکٹ کی مشق نہ کر سکا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان دنوں وہاں آل انڈیا لان ٹینس چمپئن شپ کے ٹورنامنٹ شروع تھے۔ لہذا میں جیب میں نوٹ ڈال کر کرکٹ پریکٹس کی بجائے ٹینس۔ میچ دیکھنے چلا جاتا۔ شام کو ہوٹل پہنچتا تو دوست پہلے سے منتظر ہوتے اور میں ان کے ہمراہ روڈ انسپکٹری کے لئے نکل جاتا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں کلکتہ کی رنگینیوں میں ایسا کھویا کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا چنانچہ یکم جنوری کو جب ہوٹل سے نکل کر گراؤنڈ کو چلا تو متواتر شب بیداری کے باعث پپوٹے نیند سے بوجھل تھے۔ جسم بھاری تھا اور جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا بہر حال طوعاً و کرہاً گراؤنڈ پہنچا اور کھیل کا آغاز ہوا تو رہی سہی آس بھی جاتی رہی کیونکہ ہماری ٹیم کے کپتان مہاراج کوچ بہار نے "ٹاس" ہار دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ مہاراج اودھیراج نے اس خاکساری کو پہلا اوور پھینکنے کا حکم دیا۔ اور میرا دل بیٹھنے لگا مجھے بخوبی علم ہو گیا کہ آج اپنی غلط روی کا خمیازہ بھگتوں

تماشائیوں کے سامنے بھگتنا پڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بے دلی سے گیند پکڑی اور کسی نہ کسی طرح مشتاق علی کو دے ماری۔ مشتاق کوئی اناڑی تو نہ تھا کہ موقع ہاتھ سے گنوا دیتا اس نے فدوی کی پہلی ہی گیند پر تڑاخ سے چوکا لگایا اور مجھے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ میں فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ دن رات میچ کے میدانوں اور نمائش گاہوں کی سیر کرنے والا جسم گیند اندازی کے قابل نہیں رہتا۔ چنانچہ۔ اسی دن میں نے جو گیند بھی پھینکی وہ میرے لئے ندامت کا پیغام لائی اور میری وہ دُرگت بنی کہ توبہ ہی بھلی۔ مخالف ٹیم نے ایک ہی دن میں چار سو رنز بنا ڈالیں اور بندے کو ایک سو پندرہ رنز میں مبلغ ایک عدد وکٹ میسر آئی۔ دن بھر کی پٹائی کے بعد ہوٹل واپس گیا تو شرمساری کے ساتھ ساتھ بخار بھی محسوس ہونے لگا۔ اور بہت ساری چیزیں مل ملا کر نتیجہ ہماری ہار کی صورت میں بر آمد ہوا۔

میچ کے اختتام پر لاہور آیا تو مجھے بخوبی علم تھا کہ میں اپنی عمر بھر کی بنائی ہوئی ساکھ کو پانچ روزہ تفریح کی بھینٹ کر آیا ہوں۔ اور اب پھر وہی مقام حاصل کرنے کے لئے مجھے دن رات محنت کرنی ہوگی

"ریسٹ آف انڈیا" کی غیر متوقع شکست سے کرکٹ بورڈ کے اراکین بُری طرح متاثر ہوئے اور انھوں نے وہ تمام میچ جو ہم نے "انڈیا ان انگلینڈ الیون" کے خلاف کھیلنے تھے۔ نامعلوم وجہ کی بنا پر منسوخ کر دیئے اور اعلان کیا کہ زونل ٹورنامنٹ کے میچ ٹرائل میچ متصور ہوں گے۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اپنی برباد شدہ شہرت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے دن رات مشق کرنی شروع کر دی۔ اور یہ اسی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا کہ ایک ماہ بعد جب میں زونل ٹورنامنٹ میں کھیلنے کے لئے بمبئی روانہ ہوا تو مجھے آسٹریلیا جانے والی ٹیم میں اپنی شمولیت یقینی نظر آتی تھی۔ اس میچ میں کرکٹ بورڈ نے ایک اور پابندی عائد کر دی۔ جس کی رُو سے آسٹریلوی قاعدے کے مطابق ایک اوور میں آٹھ گیندیں پھینکنے کی شرط تھی۔ چنانچہ میں بمبئی پہنچا اور پہلے ہی میچ میں شمالی منطقے کی طرف سے کھیلتے ہوئے مخالف ٹیم یعنی جنوبی منطقے کے پانچ کھلاڑی آؤٹ کر کے ایک سنیچری بھی بنا ڈالی۔ اور ہماری ٹیم یہ میچ بہ آسانی جیت گئی۔ ہم نے دوسرا میچ مغربی منطقے کے

خلاف کھیلا مگر ہماری ٹیم بُری طرح ہار گئی کیونکہ مخالف ٹیم مرچنٹ، ہزارے اور سوہنی ایسے مشاق کھلاڑیوں کی موجودگی کے سبب ہر خطرے سے محفوظ تھی۔ اس ہار کے باوجود انفرادی طور پہ میں کامیاب رہا اور میں نے مغربی منطقے کی پہلی اننگ میں ہی ان کے پانچ کھلاڑی پسپا کر دیئے۔ ہمارا آخری ٹرائل میچ دہلی میں رکھا گیا۔ اور اس میں ہندوستان کے چیدہ چیدہ کھلاڑیوں کو کھیلنے کی دعوت دی گئی اور دو ٹیمیں بنا دی گئیں۔ چنانچہ میں نے اس میچ میں بھی وجے مرچنٹ کی کپتانی میں کھیلتے ہوئے امرناتھ کے پانچ کھلاڑی ناکام بنا دیئے آخری میچ کے فوراً بعد انتخابی کمیٹی نے آسٹریلیا بھیجنے والی ٹیم کا انتخاب کیا اور رات کے تقریباً بارہ بجے کھلاڑیوں کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ اعلان کے آخری الفاظ ختم ہوتے ہی میں تارگھر کی طرف دیوانہ وار بھاگا۔ کیونکہ جس منزل تک پہنچنے کے لئے میں بچپن سے کوشاں تھا وہ مجھے مل گئی اور میری توقع کے مطابق میرا نام بھی فہرست میں شامل تھا۔ میں نے والدین کو مبارکباد کا تار بھیجا اور خوشی سے رات بھر جاگتا رہا۔ اس وقت میری عمر ۱۹ برس تھی اور میں ٹیم میں

سب سے کم عمر کھلاڑی تھا جس کی بنا پر مجھے "بیب آف دی انڈین سائیڈ" کہا جانے لگا۔

"پھر" میں نے لقمہ دیا کیونکہ وہ بولتے بولتے تھکاوٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ "ٹیم مارچ کے مہینے میں منتخب ہوئی اور کھلاڑیوں کو ہدایت کی گئی کہ سب مشترکہ مشق کے لئے پندرہ اگست تک پونہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ میں سامان وغیرہ لینے کے لئے دہلی سے لاہور آیا۔" کھرّر کھرر۔ کھرّر کھرر۔ تپائی پہ پڑا ٹیلیفون چلّایا۔ "فضل محمود بول رہا ہے۔" اس نے لیٹے لیٹے چونگا اٹھایا۔ "ہرگز نہیں .... اُوں ہوں ، . . . میں بہت ضروری کام کر رہا ہوں . . . . . . پھر کسی وقت"۔ اور اس نے چونگا رکھ کر پھر بولنا شروع کر دیا۔ "لاہور پہنچا تو فسادات زوروں پر تھے۔ اور کرفیو کا نفاذ معمول بنا ہوا تھا۔ ایسے حالات میں مشق کرنی بالکل ناممکن تھی۔ لہذا وقت یونہی گذرتا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ چودہ ۱۴ اگست کو ملک تقسیم ہو گیا۔ لیکن میں نے پھر بھی حوصلہ نہ ہارا اور سترہ ۱۷ اگست کو بذریعہ طیارہ بمبئی روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ٹیم کے منتخب شدہ کپتان

دِجے مرچنٹ پیٹ کے ناسور کی وجہ سے آسٹریلیا کا دورہ نہ کرسکینگے چنانچہ کرکٹ بورڈ کی دوبارہ میٹنگ ہوئی اور بالاتفاق رائے یہ ذمّے داری امرناتھ کو سونپ دی گئی۔ امرناتھ کے علاوہ ہم سب پونہ پہنچ چکے تھے اور پونہ سے سات میل دور کرکی میں ہندوستانی اسکرین کی مملکہ شانتا آپٹے کے بنگلہ میں مقیم تھے۔ بہرصورت تربیتی کیمپ کا پروگرام مرتب ہوا اور پی۔ ٹی کے لئے ایک انگریز فوجی کپتان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کپتان صاحب ہمیں علی الصبح لمبی دوڑ کے لئے لے جاتے اور مختلف ورزشیں کراتے۔ اس کے بعد ہمارا کرکٹ پریکٹس کا پروگرام ہوتا لیکن خوبیٔ تقدیر سے ہم جس مقصد کے لئے پونہ گئے تھے وہ ایک دن بھی پورا نہ ہوا۔ اس سال مون سون کچھ دیر سے آئیں جس کے سبب اگست اور ستمبر کے مہینوں میں بھی تقریباً روزانہ بارش ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح کو ورزش تو خیر ہم کر لیتے لیکن کرکٹ کی مشق کا معاملہ دگرگوں تھا۔ چنانچہ ہم کرکٹ پریکٹس کے اوقات شانتا آپٹے کی صحبت میں گذارتے اور وہ اکثر و بیشتر ہمیں اپنی سریلی آواز میں میٹھے میٹھے گیت سناکر

محفوظ کر دیتیں۔

وقت کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر کرکٹ بورڈ کی سہ بارہ میٹنگ ہوئی اور ہمیں مطلع کیا گیا کہ ہم اپنے گھروں سے ضروری سامان لے کر نو اکتوبر تک کلکتہ پہنچ جائیں۔ جہاں سے ہمیں بذریعہ طیارہ آسٹریلیا کو پرواز کرنی ہوگی۔ میں احکام کے بموجب پونہ سے چل پڑا اور نو ستمبر کو بمبئی جا اترا اور جگہ مخصوص کرانے کی خاطر سیدھا ہوائی اڈے پہنچا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ خطرے کے پیش نظر مسلمانوں کو براستہ دہلی جانے کی اجازت نہیں چنانچہ میں نے کراچی کے لئے نشست مخصوص کرالی اور کراچی سے ہوتا ہوا تیرہ[13] ستمبر کو لاہور پہنچا۔ گھر گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ والدین کو میری ایک بھی چھٹی یا تار موصول نہ ہوئی۔ جس کے باعث وہ سخت مضطرب تھے۔ بہر حال مجھے دیکھ کر ان کی پریشانی اور اضطراب تو جاتا رہا لیکن وہ میرے دوبارہ ہندستان جانے پر رضامند نہیں تھے......"

گھرر گھرر...... ٹیلیفون مکرر چیخا اور وہ پھر اپنے مخاطب کے حضور عدیم الفرصتی کی وجوہ اور طویل معذرت پیش کرنے کے بعد ایک تجویز

پیش کر رہا تھا: "دیکھئے! میں اپنے ایما پر کسی دوست کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ کھانا آپ کے ساتھ کھا کر ڈکار میرے ہاں ماریں گے۔ بس سمجھ لیجیئے گا مجھے دعوت مل گئی"۔ اور یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔" ہاں جی" وہ مسکراتے ہوئے بولا: "آپ کے والدین آپ کو دوبارہ ہندوستان بھیجنے پر آمادہ نہ تھے"۔ میں نے یاد دہانی کرائی "میں ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ سولہ ستمبر کو انسپکٹر جنرل صاحب پولیس نے مجھے انٹرویو کے لئے یاد فرمایا۔ میں ان کی خدمت میں اسی روز حاضر ہوا اور ملازمت کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مجھے فوراً بطور انسپکٹر پولیس فورس میں بھرتی کر لیا۔..... فسادات کی وجہ سے حالات پہلے ہی ابتر تھے اس پر والدین کی عدم رضامندی اور پھر ملازمت کا مل جانا۔ ان تمام باتوں نے آسٹریلیا جانے کے جذبے کو سرد کر دیا۔ اور شاید میں نے یہ زندگی میں سب سے بڑی غلطی کی ورنہ کرکٹ میں جو مقام میں نے اب پایا ہے اسی وقت مل جاتا۔ بہرکیف میں نے نہایت افسردہ دلی سے ٹیم کے کپتان امرناتھ کو بذریعہ تار اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے آسٹریلیا جانے سے معذرتی

کا اظہار کیا اور کچھ عرصہ بعد پولیس ٹریننگ کے لیئے "برڈووڈ بیرکس" وارث روڈ چلا گیا۔

اس وقت تک پاکستان کرکٹ بورڈ معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ لہذا پاکستان میں کرکٹ کی غیر مقبولیت قدرتی تھی۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ میں کرکٹ سے روز بروز دور ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ نہ تو صوبائی میچ ہوئے اور نہ ہی مجھے کسی ٹیم کی طرف سے مدعو کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب ملکی حالات معمول پر آ گئے تو ۱۹۴۸ء میں "کرکٹ کنٹرول بورڈ آف پاکستان" کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس کے باوجود بورڈ کی سرگرمیاں محدود تھیں۔ سال میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ اچھا میچ ہو جاتا ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔ میں بذاتِ خود اُن دنوں کرکٹ کی بجائے کبھی کبھار شام کو ہاکی یا بیڈمنٹن کھیلنے چلا جاتا۔ اس وجہ سے میری کرکٹ فارم گرتی چلی جا رہی تھی اور اگرچہ میری شہرت اَب بھی کافی تھی لیکن درحقیقت میں ہندوستان کی ٹیم میں کھیلنے والا افضل نہ رہا تھا۔

وقت یونہی گذر رہا تھا کہ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں پاکستانی کرکٹ

میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے کیونکہ جزائر غرب الہند کی کرکٹ ٹیم بھارت اور پاکستان کا دورہ کر رہی تھی۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق لاہور میں ایک غیر سرکاری ٹسٹ میچ کھیلا گیا جس میں میں بھی شامل تھا لیکن کرکٹ سے کافی دیر بے نیاز رہنے کے سبب مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے دوبارہ پہلی سی ساکھ بنانے کے لئے شبانہ روز محنت کی ضرورت ہے۔ لہذا میں نے ایک مرتبہ پھر خود کو پچ اور وکٹوں کے حوالے کر دیا اور ۱۹۴۹ میں سیلون کا دورہ کرنے کے لئے پاکستان کرکٹ ٹیم میں منتخب ہو گیا۔ سیلون کو روانگی سے پیشتر میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ محمود اب پہلا سا کرکٹر نہیں۔ خدا خیر کرے مجھے یہ سن کر جہاں دکھ ہوا وہاں میں نے پھر اپنے اصل مقام پر پہنچنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور شاید یہ میری مضبوط قوتِ ارادی کا نتیجہ تھا کہ میں نے سیلون میں کچھ غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ پاکستان ٹیم نے سیلون کے ساتھ دو ٹسٹ میچ کھیلے اور دونوں جیت لئے۔ میں نے ان دو ٹسٹ میچوں میں اٹھارہ وکٹیں حاصل کیں لیکن اس

کا اظہار کیا اور کچھ عرصہ بعد پولیس ٹریننگ کے لئے "برڈوڈ بیرکس" وارث روڈ چلا گیا۔

اس وقت تک پاکستان کرکٹ بورڈ معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ لہٰذا پاکستان میں کرکٹ کی غیر مقبولیت قدرتی بھی۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ میں کرکٹ سے روز بروز دور ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ نہ تو صوبائی میچ ہوئے اور نہ ہی مجھے کسی ٹیم کی طرف سے مدعو کیا گیا تھوڑی دیر بعد جب ملکی حالات معمول پہ آ گئے تو ۱۹۴۸ء میں "کرکٹ کنٹرول بورڈ آف پاکستان" کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس کے باوجود بورڈ کی سرگرمیاں محدود تھیں۔ سال میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ اچھا میچ ہو جاتا ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔ میں بذاتِ خود اُن دنوں کرکٹ کی بجائے کبھی کبھار شام کو ہاکی یا بیڈمنٹن کھیلنے چلا جاتا۔ اس وجہ سے میری کرکٹ فارم گرتی چلی جا رہی تھی اور اگرچہ میری شہرت اب بھی کافی تھی لیکن درحقیقت میں ہندوستان کی ٹیم میں کھیلنے والا افضل نہ رہا تھا۔

وقت یونہی گذر رہا تھا کہ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں پاکستانی کرکٹ

میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے کیونکہ جزائر غرب الہند کی کرکٹ ٹیم بھارت اور پاکستان کا دورہ کر رہی تھی۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق لاہور میں ایک غیر سرکاری ٹسٹ میچ کھیلا گیا جس میں میں بھی شامل تھا لیکن کرکٹ سے کافی دیر بے نیاز رہنے کے سبب مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے دوبارہ پہلی سی ساکھ بنانے کے لئے شبانہ روز محنت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں نے ایک مرتبہ پھر خود کو پچ اور وکٹوں کے حوالے کر دیا اور ۱۹۴۹ میں سیلون کا دورہ کرنے کے لئے پاکستان کرکٹ ٹیم میں منتخب ہو گیا۔ سیلون کو روانگی سے پیشتر میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ محمود اب پہلا سا کرکٹر نہیں۔ خدا خیر کرے مجھے یہ سن کر جہاں دکھ ہوا وہاں میں نے پھر اپنے اصل مقام پر پہنچنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور شاید یہ میری مضبوط قوتِ ارادی کا نتیجہ تھا کہ میں نے سیلون میں کچھ غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ پاکستان ٹیم نے سیلون کے ساتھ دو ٹسٹ میچ کھیلے اور دونوں جیت لئے۔ میں نے ان دو ٹسٹ میچوں میں اٹھارہ وکٹیں حاصل کیں لیکن اس

کے باوجود میں بہت زیادہ مقبول نہ ہو سکا ...... سیلون سے
واپس آئے تو کچھ عرصہ بعد "کامن ویلتھ الیون" کی آمد کی اطلاع ملی
چنانچہ دسمبر ۱۹۴۹ میں یہ ٹیم پاکستان آئی۔ لاہور میں ایک ٹسٹ
میچ کھیلا گیا لیکن بدقسمتی سے ہمیں شرمناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا
جس سے پاکستان کرکٹ کی رہی سہی ساکھ بھی مٹی میں مل گئی۔ اور
عوام نے بد دل ہو کر پاکستان میں کرکٹ بند کرو کے نعرے لگانے
شروع کر دیئے۔ اس ردِ عمل کا اثر یہ ہوا کہ پاکستان میں کرکٹ کا شوق
روز بروز کم ہوتا چلا گیا حتےٰ کہ "کامن ویلتھ الیون" کے رخصت ہو
کے تھوڑی دیر بعد جب سیلون کی ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا تو لاہور
اور کراچی کے دونوں ٹسٹ میچوں میں تماشائیوں سے زیادہ کھلاڑیوں
کی تعداد تھی۔ اگرچہ ہم نے دونوں ٹسٹ میچ جیت لئے اور تنہا
میں نے اٹھارہ وکٹیں حاصل کیں مگر عوام اور پریس دونوں نے
اسے کوئی اہمیت نہ دی اور پاکستان میں کرکٹ کا کھیل آخری
سانس لینے لگا۔

اسی دوران میں میرا تبادلہ لاہور سے راولپنڈی ہو گیا۔ اور

میں بھی کرکٹ کو بھول کر دفتری مصروفیات میں الجھ گیا۔ ہفتہ میں شاذ و نادر ہی کبھی ایک آدھ بار گراؤنڈ کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی۔ اور بعض اوقات تو میں قنوطی ہو کر سوچتا کہ کرکٹ کا خیال ترک کر دوں کیونکہ اس وقت پاکستان میں کرکٹ کا مستقبل بالکل تاریک نظر آتا تھا۔

اسی اثنا میں پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ نے اطلاع دی کہ ایم۔ سی۔ سی کی ٹیم ۵۱ء کے اوائل میں انڈو پاکستان کا دورہ کریگی اور پاکستان کے ساتھ لاہور اور کراچی میں دو ٹسٹ میچ کھیلے گی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ایم۔ سی۔ سی کی ٹیم ۵۰ء کے اواخر یعنی دسمبر میں ہی پہنچ جائے گی۔ چنانچہ میں ان کی آمد سے ایک ماہ پیشتر محکمہ سے مہینہ بھر کی رخصت لے کر پنڈی سے لاہور پہنچا۔ اور دل لگا کر مشق شروع کر دی۔ اس زمانے میں میری شہرت اس قدر خراب تھی کہ بورڈ کے بیشتر ممبران مجھے ٹسٹ میچوں میں شریک کرنے سے گریزاں تھے۔ حالانکہ میری باؤلنگ میں کوئی خاص کمزوری واقع نہ ہوئی تھی۔ مجھے کرکٹ کنٹرول بورڈ کے اراکین کی اس رائے سے بے حد صدمہ

پہنچا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں ایم۔سی۔سی کے بیٹسمینوں سے خوب اچھی طرح نبٹ سکتا ہوں۔ قصہ مختصر میں پریکٹس کرتا رہا اور اتنے میں ایم۔سی۔سی کے کھلاڑی بھی آدھمکے۔ اور سب سے پہلے سیالکوٹ میں پنجاب کے خلاف صوبائی میچ کھیلے۔ میں نے اس میچ میں ایک مرتبہ پھر ثابت کیا کہ فی الحال میرا کھیل مشکوک نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اس میچ میں ۲۴ رنز بنانے کے علاوہ ان کے پانچ کھلاڑی بھی میدان کی بجائے آرام کرسیوں کی زینت بنا دیئے۔ صوبائی میچ کھیل کر لاہور میں پہلا ٹسٹ میچ شروع ہوا لیکن تمام حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں کیونکہ کھیل کے میدان میں میری بائیں ران کے پٹھے بُری طرح خراب ہو گئے اور میں کھیلنے سے معذور ہو گیا۔ پہلا ٹسٹ میچ برابر رہا۔ اور دوسرا ٹسٹ میچ کھیلنے تک میں تندرست ہو گیا۔ کراچی کا ٹسٹ میچ میٹنگ پہ کھیلا جانا تھا۔ مجھے اپنی غیر معمولی کامیابی کی قوی امید تھی۔ کیونکہ میری گیند میٹنگ وکٹ پہ کافی ٹرن لیتی اور وکٹ سے تیزی کے ساتھ اُوپر اٹھتی ہے۔ میری خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ کراچی جانے سے پیشتر میں نے اکثر احباب کو پورے وثوق سے کہہ دیا کہ دوسرا ٹسٹ میچ میں اکیلا

ہی جیت لوں گا۔ اور یہ سُن کر میرے دوستوں نے مجھے مغرور کا لقب دے دیا۔ بہر حال کراچی میں میچ شروع ہوا اور میں نے مخالف ٹیم کو ۱۲۳ رنز میں آؤٹ کر دیا۔ میں نے چالیس رنز میں چھ وکٹوں پر ہاتھ صاف کیا اور دونوں انگز میں کافی رنز بھی بنائیں۔ یہاں تک کہ وننگ شاٹ بھی میں نے لگایا۔ وننگ شاٹ لگنے کی دیر تھی کہ بیس ہزار تماشائی میرے اور کاردار کی طرف دیوانہ وار لپکے اور کھیل کا میدان زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔

تماشائیوں میں سابق وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین بھی تشریف فرما تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اور کاردار کو یاد فرمایا۔ جب میں انہیں جا کر ملا تو انہوں نے فرطِ مسرت سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کیا اور قریب کھڑے ہزاروں تماشائیوں نے بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے نعرے بلند کئے۔ مجھے چونکہ ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ لہٰذا میں اسی شام فرنٹیر میل میں بیٹھ کر واپس پنڈی روانہ ہو گیا۔

مارچ ۱۹۵۲ء میں شہزادی الزبتھ یعنی موجودہ ملکہ انگلستان نے اپنا دورہ سیلون رکھا ہوا تھا۔ اور ان کی آمد کی خوشی میں سیلون

کرکٹ بورڈ نے ایم ۔سی ۔سی کے ساتھ میچ کھیلنے کا پروگرام بنا کر ایک کامن ویلتھ ٹیم تشکیل دی اور پاکستان کی طرف سے صرف مجھے اور امتیاز کو مدعو کیا گیا۔ بھارت کی نمائندگی ونو منکڈ اور اُمریگر نے کی اور آسٹریلیا کی طرف سے گراہم ہول، نیل ہاروے اور بیپیس ملر نے شرکت کی جو دنیا کے بہترین کھلاڑی تصور کئے جاتے ہیں ٹیم کے باقی چار کھلاڑی سیلون سے منتخب کئے گئے اور اس ٹیم کا نام کامن ویلتھ ٹیم تجویز ہوا۔ اور اس کی قیادت سیلون کے "اوپننگ بیٹسمین" ڈی سیرم کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ مارچ کے مہینہ میں یہ میچ ۳۵۰۰۰ تماشائیوں کے سامنے کولمبو کی اوول گراونڈ میں شروع ہوا اور ہماری ٹیم نے ٹاس جیت کر اپنی بیٹنگ کا آغاز کر دیا۔ اور ہم تمام کھلاڑی خوب جم کر کھیلے۔ ہمارا کل اسکور ۵۰۰ رنز سے بھی کچھ زائد ہوا۔ جس میں سے ۲۰۰ رنز ملر اور گنو کی مرہونِ منّت تھیں، جنھوں نے سینچریاں بنائیں۔ نیل ہاروے نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ۹۰ رنز بنانے کے بعد میدان کو چھوڑا۔ اس دن میں آسٹریلوی بیٹسمین ول کی بیٹنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کیونکہ ان کا انداز دیگر ممالک کے کھلاڑیوں

سے بالکل نرالا تھا۔ وہ جب بھی بیٹنگ کے لئے آتے تو معلوم ہوتا
کہ اب قیامت تک آؤٹ نہیں ہوں گے۔

ہماری اِننگ ختم ہونے پر ایم۔ سی۔ سی نے کھیل کا آغاز کیا
اور ان کے مقابلے میں بیس مِلر بولنگ کے لئے نکلے۔ بیس ملر دنیا
کے بہترین آل راؤنڈر سمجھے جاتے ہیں اور تیز گیند اندازی میں خصوصاً
مشہور ہیں۔ اس دن چونکہ وکٹ سخت تھی لہذا ان کی گیندوں میں اور
بھی شدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے پہلا اوور میڈن کیا اور
ڈی سیرم نے دوسری طرف سے مجھے گیند پھینکنے کی دعوت دی۔ اور
میرا دل دھک دھک کرنے لگا قدم ڈگمگانے لگے۔ مجھے فوراً خیال
آیا کہ آج میرا مقابلہ آسٹریلوی بولر بیس ملر کے ساتھ ہے اگر میری گیند
پٹ گئی تو؟ بہرکیف میں نے خود کو سنبھالا دیا اور پورے اعتماد سے
گیندیں پھینکنی شروع کیں اور میں نے بھی پہلا اوور میڈن کیا۔ کامن
ویلتھ ٹیم میں چونکہ پاکستان، بھارت، آسٹریلیا اور سیلون کے چیدہ
چیدہ کھلاڑی شریک تھے۔ اس لئے ہماری فیلڈنگ بہت زیادہ
مضبوط تھی جس کے سبب ایم سی سی کے بیٹس مین گیند کو ایک دو مرتبہ

سے زیادہ باؤنڈری لائن سے پرے نہ پھینک سکے۔ اور ان کی پہلی اننگ میں جو کیچ بھی نکلا پکڑا گیا۔ چنانچہ انگریز کھلاڑیوں نے بمشکل ستّر رنز بنائیں اور اپنی پہلی اننگ ختم کر بیٹھے۔ میں نے اکیس رنز میں اُن کے چار کھلاڑی ناکام بنائے۔ ملکوستا بیس رنز میں چار وکٹیں دستیاب ہوئیں۔ اور منکڈ کو اُنیس رنز میں دو وِکٹیں میسّر آئیں۔

ایم۔سی۔سی کو دوسری مرتبہ بیٹنگ کی دعوت دی گئی اور وہ دوبارہ صرف دوسو رنز بنا کر میدان سے رخصت ہو گئی۔ میں دوسری اننگ میں فقط دو کھلاڑی آؤٹ کر سکا۔ ملر میری بَولنگ سے بے حد متاثر ہوا اور اخبارات میں بیان دیا کہ اِنگلستان کی ٹیم کے مقابلے میں میری بَولنگ بہت کامیاب رہی۔

سیلون سے فارغ ہو کر لاہور پہنچا تو پاکستانی ٹیم کو بھارتی کرکٹ بورڈ کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہو چکا تھا۔ جس میں تمام بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ انہی ایام میں پاکستان کو امپیریل کرکٹ کانفرنس میں نمائندگی حاصل ہو گئی۔ جس کے باعث یہ طے پایا کہ اِنگلستان کے ساتھ کھیلے جانے والے

ٹسٹ میچ آفیشل ٹسٹ میچ متصوّر ہوں گے۔ کیونکہ پاکستانی ٹیم
اس سے پیشتر جتنے میچ کھیلی تھی وہ سب غیر سرکاری یعنی اَن آفیشل
قرار دیے گئے۔ چنانچہ ہمارے تمام کھلاڑیوں نے ایک نئے جوش اور
ولولے کے ساتھ خوب زور وشور سے تیاری شروع کر دی۔ اور
اکاون ۱۹۵۱ کے اوائل کرکٹ سیزن میں ہی ٹرائل میچوں کا آغاز کر دیا
اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ٹیم کا انتخاب ہوا۔ اور قیادت کے لئے
عبدالحفیظ کاردار کا نام بالاتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔ انتخابی مہم سے
قبل میرا خیال تھا کہ میرا بحیثیت نائب قائد کے منتخب ہو جانا یقینی
امر ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ تقدّم (سینیارٹی) کے لحاظ سے
کاردار کے بعد میرا نمبر ہے۔ اور دوسرے کھیل کے اعتبار سے بھی میری
گذشتہ خدمات بقیہ کھلاڑیوں سے کسی صورت کم نہ تھیں —— لیکن
انتخاب کے وقت میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب نائب کپتانی
کے فرائض انور حسین کو تفویض کر کے مجھے قطعاً نظر انداز کر دیا گیا
مجھے اس فیصلے سے شدید صدمہ ہوا۔ اور جی چاہا کہ میں ٹیم میں شمولیت
سے انکار کر دوں لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ یہ اقدام نہ صرف

سپورٹس میں سپرٹ کے منافی ہے بلکہ ملک اور قوم سے غداری کے مترادف بھی۔ چنانچہ میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا! ور ۲ اکتوبر کو ٹیم کے ماندہ ارکان کے ہمراہ میں بھی جیمخانہ کلب کے ہنگاموں میں شریک تھا۔ ہمیں اس روز نہایت شان و شوکت سے رخصت کیا گیا۔ اور ہمارا یہ چھوٹا سا قافلہ ادمنی لبس کی وساطت سے واہگہ بورڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔" جی" میں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا اور پنیسل تراشنے کے لئے چاقو قسم کی کوئی چیز تلاش کرنا شروع کر دی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ میری شرافت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی فکر میں ہیں"۔ اس نے سکریپ بک سنبھالتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔" کیا مطلب" میں سٹپٹانے کے ساتھ ساتھ مجسّم سوالیہ نشان بن گیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں انجانے میں کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھا ہوں۔ "مطلب تو بالکل صاف ہے"۔ اس نے اٹھتے ہوئے لاپرائی سے جواب دیا۔" یعنی" مجھے اپنی کم فہمی کا اعتراف کرنا ہی پڑا کیونکہ میں اب بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔" یعنی یہ کہ نو بج چکے ہیں۔

سمجھے حضور"۔ اور فضا میں دو قہقہے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ میں نے اپنی فائیل اٹھائی اور اس کے ہمراہ گھر کو روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن فضل نے ٹیلیفون پر دو دن کے لیے معذرت چاہی اور وعدہ کیا کہ وہ تیسرے دن عید میلاد النبی کی تعطیل کو صبح سے شام تک میرے ساتھ رہے گا اور اس غیر حاضری کی کسر نکال دیگا۔ چنانچہ میں تیسرے روز یعنی نو نومبر کی صبح کو تقریباً گیارہ بجے صدر پہنچا تو واقعی ساری کسر نکل گئی۔ وہ سارا دن اسلامیہ ہائی اسکول کے طالبعلموں کے ساتھ میچ کھیلتا رہا اور پانچ بجے کے قریب سینکڑوں شائقین اور آٹوگراف لینے والوں کی زد سے بچتا بچاتا تھانے پہنچا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے بمشکل کپڑے تبدیل کئے ہوں گے کہ باہر کھڑی کار نے ہارن کی آواز میں چلانا شروع کر دیا جیسے پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ بہت ہو چکی فضل صاحب اب تو چلو۔ "انعام صاحب" فضل نے پیٹی کستے ہوئے ذرا دھیرے سے کہا اور میرا ماتھا وہیں ٹھنکا۔ مجھے یکدم لاہور ہیلتھ کلب کے دو ممبر اصحاب یاد آ گئے جو دو روز پیشتر

کلب کی طرف سے فضل کو مدعو کر گئے تھے جہاں اسے حاضرین سے خطاب بھی کرنا تھا۔" بات یہ ہے" اس نے تمہید باندھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور اپنی بوشرٹ کی شکنیں درست کرنی شروع کر دیں۔ میں اس محویت کی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا مجھے علم تھا کہ اب آگے کہنے کی اس میں ہمت نہیں۔ کیونکہ کسی کو مایوس کرنا اس کی شریعت میں کفر ہے جو اسے کبھی بھی گوارا نہیں۔ مجھے اس کی اس بیچارگی پر رحم آنے لگا لیکن میں نے جان بوجھ کر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔" آپ کچھ کہنے والے تھے"۔" ارے ہاں —— اس نے سیاہ چشمہ لگا کر کہا بات یہ ہے کہ آپ پہلے میرے ساتھ لاہور ہیلیتھ کلب چلیں گے۔ وہاں سے فراغت پا کر ایک اور جگہ اور پھر آپ جہاں کہیں گے بیٹھ کر اپنا کام شروع کر دیں گے۔"

"خوب" میں نے بظاہر طنزاً کہا اور ہیلیتھ کلب جانے سے معذوری ظاہر کی۔" اور کھتے" اس نے ہارن کی مکرر یاد دہانی پر جلدی سے کہا اور اپنا آخری فیصلہ صادر کر دیا" ڈرائیور" اس نے پاس کھڑے ڈرائیور کو نادر شاہی حکم سنا دیا" تم گاڑی میں صاحب کو

گھر چھوڑ کر ہمارے مکان پہ پہنچ جاؤ اور سات بجے ہمیں پھر لے چلو ——— سمجھے" "جی صاب" ڈرائیور نے سر ہلایا اور وہ بائی بائی کہہ کر چل دیا۔

اپنی جائے رہائش پہ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد سیدھا خواجہ صاحب سے ملا۔ اور تمام روئداد سنائی۔ اور آخر یہ طے پایا کہ سات بجے جب وہ یہاں آئے۔ تو اسے اس معاملہ کی اہمیت پہ سنجیدگی سے غور کرنے کی بابت کہا جائے۔ چنانچہ ہم دونوں سڑک کے کنارے ٹہلنے لگے اور باتوں باتوں میں سات بجا دیئے۔ سات . . . سوا سات . . . . . ساڑھے سات . . . . . اور حتیٰ کہ آٹھ بجنے کو آئے لیکن شہزادہ صاحب کا دور دور تک کوئی سراغ نہیں ملتا تھا قریب تھا کہ ہم مایوس ہو کر بستروں کو رونق بخشتے۔ کہ آگے پیچھے دو کاریں دندناتی ہوئیں ہمارے پاس آ کر رک گئیں۔ اور دوسرے لمحے وہ باہر نکل کر مجھے ایک دم تیار ہونے کی تلقین کرنے لگا میں فائل لینے کے لئے اوپر گیا۔ اور اسے خواجہ صاحب کے حوالے کر دیا۔ چند ثانیے بعد میں واپس آیا تو وہ حسب عادت "آپ فکر نہ کیجئے"

قسم کے الفاظ زوردار لہجے میں خواجہ صاحب کے گوش گذار کر رہا تھا۔ بہرحال ہم دونوں نے خواجہ صاحب سے رخصت چاہی اور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد ہم کہاں گئے اور کیا ہوا...... یہ ایک طویل داستان ہے۔ بہرحال ہر طرف سے فارغ ہو کر ہم ساڑھے نو بجے شہزان میں داخل ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ اب کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ لیکن ٹالاہو کاؤنٹر پہ بیٹھی ہوئی مس صاحبہ کا جس نے گیلری کا رُخ کرنے سے پیشتر ہی اسے آلیا۔ اور لگی اپنے ہیرو کے قدموں میں عقیدت کے پھول نچھاور کرنے جنہیں وہ مسکراتے ہوئے چہرے اور خندہ پیشانی سے قبول کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے وہاں سے گلو خلاصی ہوئی۔ اور ہم شہزان کی سونی سونی گیلری کے ہیرونی گوشے کی طرف لپکے اور دھم سے ایک صوفے پہ نیم دراز ہو گئے۔ اس دن خلافِ معمول وہاں کوئی رونق نہ تھی۔ کیونکہ ہفتہ ریڈ کراس منانے کی وجہ سے لاہور کی جملہ رنگینیاں اور دلفریب ہنگامے سمٹ سمٹا کر گرفن اور بریٹ میں جلوہ گر تھے۔ میرے لئے ایسا موقع ہاتھ لگنا نہایت ہی نیک فال تھی۔ کیونکہ میں اپنے برباد شدہ وقت

کی کسر اچھی طرح نکالنا چاہتا تھا۔ اور بھارتی دورے کی پوری سرگذشت قلمبند کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ چنانچہ لمحہ بھر آرام کئے بغیر فائل نکالی اور کاغذ ترتیب دینے لگا۔ اتنے میں بیرا آیا.... اور اس ستم ظریف نے بجائے آرڈر لینے کے مس صاحبہ والی مشق دہرانا شروع کر دی "صاب آپ نے ہماری اور پاکستان کی لاج رکھ لی"۔ بیرے نے اس کی طرف فخر و عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا اور اس گھڑی اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں خراجِ عقیدت ادا کر رہا ہو.... فضل نے بیرے کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد اسے ڈنر لانے کو کہا.... بارے کھانا آیا..... اور ہم نے جلد ہی فارغ ہو کر فضل کی اقامت گاہ کا رُخ کر لیا۔ کیونکہ ہوٹل صرف آدھ گھنٹہ اور کھلا تھا اور اتنا مختصر وقفہ ہماری اس دن کی نشست کے لئے قطعاً ناکافی تھا۔ چنانچہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد وہ اپنے ڈرائینگ روم کے صوفے پہ بیٹھا نائٹ گون کی بیٹی میں گرہ لگا کر ماضی کی بھولی بسری یادوں کو صفحہ قرطاس پہ منتقل کرواتے ہوئے کہہ رہا تھا: "بس میں بیٹھتے

ہی میں نے اپنی تمام توجہ بھارتی کھلاڑیوں کے کھیل پر مرکوز کردی۔ میں ہر ایک کے انداز سے پوری طرح واقف تھا اور ذہن میں ایک واضح خاکہ مرتب کر رہا تھا کہ میں نے کس کو کس ڈھنگ سے آؤٹ کرنا ہے میں اسی سوچ میں مستغرق تھا۔ کہ امرتسر آگیا۔ جہاں ہمارا بڑی گرمجوشی سے سواگت کیا گیا۔ فرداً فرداً ملاقات اور تعارف وغیرہ کی رسومات سے فراغت پانے کے بعد ہمیں امپیریل ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ جہاں ہماری رہائش کا بندوبست تھا۔ ہوٹل کے باہر مکمل حفاظتی انتظامات کیئے گئے تھے اور سارا دن ایک عدد مسلح سپاہی دروازے پر موجود رہتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ انہوں نے ہماری آؤ بھگت اور خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور ہماری ہر خواہش کی فوری تکمیل انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ لیکن اس کے باوجود امرتسر میں گھومنے پھرنے کی حسرت دل میں ہی رہی کیونکہ ہمارے باہر نکلنے پر کڑی پابندی عائد تھی۔ حتیٰ کہ ہمیں اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ ہم ہوٹل سے نکل کر سامنے والی سڑک پر چند لمحوں کے لئے ٹہل سکیں..... "اوہ..... غضب ہو گیا" اور میں نے "چچ چچ"

کی گردان کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں سر ہلانا شروع کر دیا۔ "کیا ہوا" ..... وہ گھبرا سا گیا۔ "کچھ نہیں" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اب تو موقع ہاتھ سے جاتا رہا"۔ "ارے بھائی ہوا کیا..... ؟ کیسا موقع ہاتھ سے جاتا رہا..... آپ تو معموں میں باتیں کرتے ہیں"۔ وہ متحیر نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے جھنجھلا کر بولا۔ "ہونا کیا ہے"۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس قیدِ تنہائی میں بندہ بھی آپ کے ساتھ ہوتا تو مزہ آجاتا"۔ "کیوں" اس نے اور زیادہ تعجّب سے پوچھا..... "اس لئے کہ یہ انٹرویو ایک دو نشستوں میں ختم ہو جاتا۔ اور مجھے اس روز روز کی سر دردی سے نجات مل جاتی" "لاحول ولاقوۃ"۔ اس نے اطمینان سے گہرا سانس لیا۔ اور پھر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ بہر حال ۱۰ اکتوبر کو گاندھی گراؤنڈ میں پانسہ جیت کر..... ۱۵ تماشائیوں کے سامنے ہماری ٹیم نے اپنے پہلے کھیل کا آغاز کیا۔ اُس دن ہم نے ۲۶۰ رنز بنائیں اور بھارت کے چھ کھلاڑی آؤٹ کئے۔ سب سے کم سن صرف سترہ سالہ کھلاڑی محمد حنیف نے اپنے بے مثال کھیل کا مظاہرہ کیا

اس نے دورے کی اوّل رونمائی فرسٹ اپیرنس میں ہی ۱۲۱ رنز بنا کر لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت اور اہلیت کا سکہ جما دیا۔ شام کے وقت تمام کھلاڑی کاردار کے کمرے میں جمع ہوئے۔ تاکہ دن بھر کی کارروائی کا جائزہ لے کر کل کی بابت صلاح مشورہ کریں تقریباً سبھی کھلاڑی اپنے دن کے کھیل سے مطمئن نظر آ رہے تھے اور خصوصاً حنیف تو پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ہاں کاردار تیسرے بیٹسمین کی کمی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اسے کسی ایسے کھلاڑی کی تلاش تھی جو مطلوبہ جگہ پر بطریق احسن کھیل سکے۔ چنانچہ اس نے اس شام وائس پریذیڈنٹ پاکستان کرکٹ بورڈ جسٹس کارنیلیس کو بذریعہ تار اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ اور انتخاب کے لئے اصغر علی کا نام تجویز کیا۔

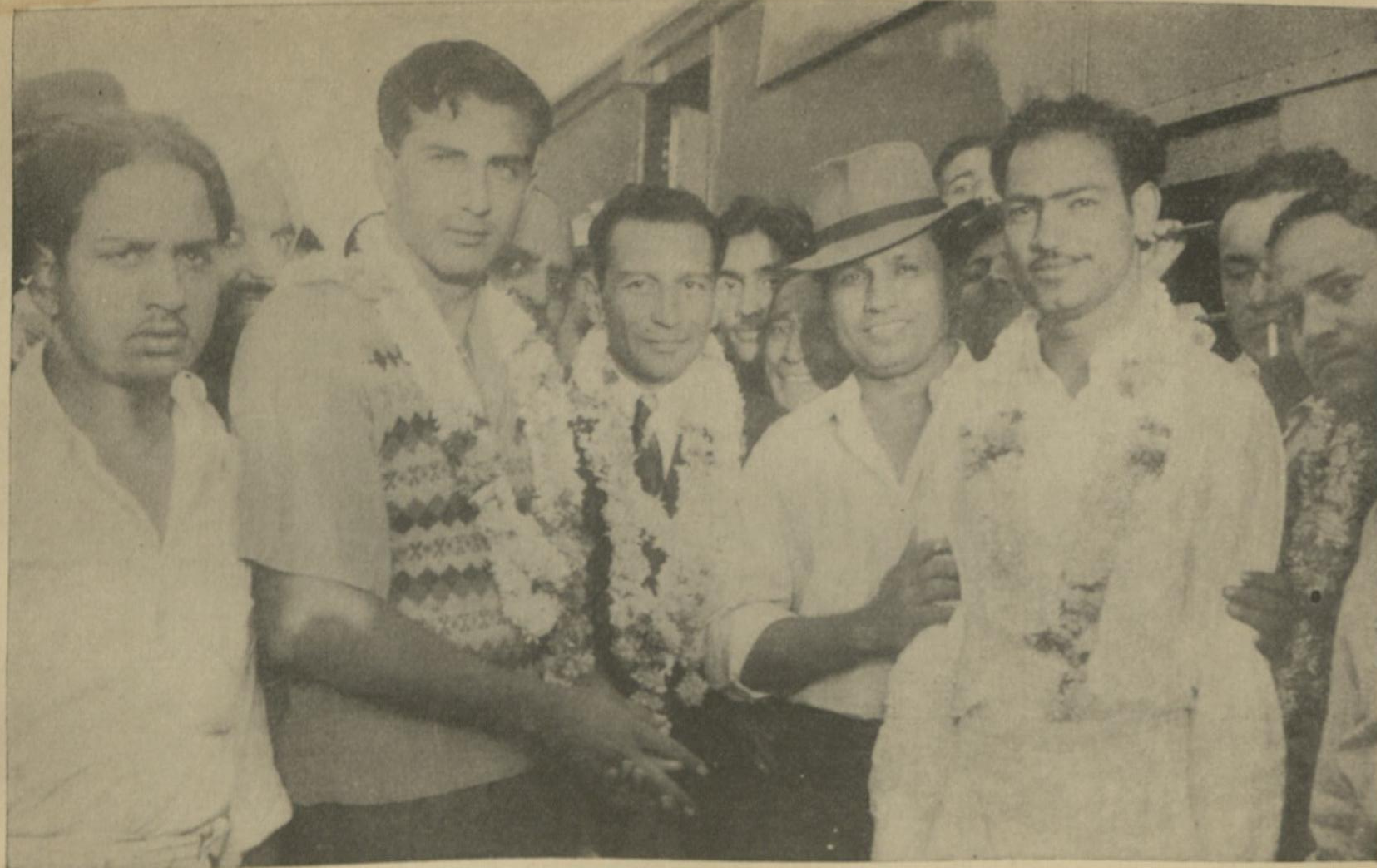
اگلے روز یعنی ۱۱ تاریخ کو میدان کارزار پھر گرم ہوا اور ہماری ساری ٹیم ۳۱۹ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ نارتھ زون نے اپنے کھیل کے پہلے دن پہلی اننگ میں ۱۸۱ رنز بنائیں۔ اور اس کے ۵ کھلاڑی آؤٹ ہوئے۔ میں نے کل ۲۴ اوور کئے۔ اور پچاس رنز میں چار وکٹیں لیں

جس کے باعث باؤلنگ آنرز کا حقدار میں ٹھہرا۔ ۔ ۔ باقی سب کھلاڑی حسبِ معمول کھیلے ۔ ۔ ۔ ۔

۱۲ تاریخ کو کھیل نارتھ زون کی طرف سے شروع ہوا۔ اور اس کے تمام کھلاڑی ۲۲۰ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے پاکستان نے اپنی دوسری اننگ میں ۲۴۱ رنز بنائیں اور اس عرصہ میں فقط دو کھلاڑی آؤٹ ہوئے حنیف نے ایک مرتبہ پھر سینچری بنا کر اپنی غیر معمولی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اور واقعی یہ کچھ اسی کا حصّہ تھا کہ اس نے افتتاحی میچ کی ہر اننگ میں سینچری بنائی۔

امرتسر سے فارغ ہو کر پاکستان کرکٹ ٹیم ۳ تاریخ کو دہلی پہنچی اور سوس ہوٹل میں قیام کیا۔ شام کے وقت عزت مآب جناب شعیب قریشی پاکستانی ہائی کمشنر متعینہ بھارت نے ہمیں ایک عشائیہ پر مدعو کیا۔ جہاں اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت بہت فکر مند نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں پاکستانی ٹیم ہار نہ جائے۔

ان کی دلی تمنا تھی۔ کہ ہم لوگ بہتر سے بہتر کھیل کا مظاہرہ کریں۔ القصّہ ہم وہاں سے رخصت ہو کر واپس ہوٹل پہنچے اور ٹسٹ ٹیم کا انتخاب ہوا۔ جس میں میرے علاوہ کاردار، انور حسین، حنیف محمد، نذر محمد امتیاز، مقصود، خان محمد، اسرار علی، وقار حسین اور امیر الٰہی شامل تھے ڈولتھ مین یعنی بارھویں کھلاڑی کے لئے وزیر محمد کو چنا گیا۔ بھارت کی طرف سے امرناتھ، ہزارے، منکڈ، ادھیکاری، گل محمد سین، امریگیر، غلام محمد، رام چند، مانجریکر اور پنکج رائے حصّہ لے رہے تھے۔ ۱۵ تاریخ کو فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ میں ٹسٹ میچ کا آغاز ہوا کم وبیش ۲۵،۰۰۰ شائقین کا ہجوم کھیل دیکھنے کے لئے جمع تھا۔ میں اپنی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ کیونکہ یہ میرے لئے نئی جگہ نہ تھی بلکہ یہ وہی گراؤنڈ تھی۔ جہاں میں نے تقسیم ملک سے قبل "ریسٹ آف انڈیا" کی طرف سے کھیلتے ہوئے انڈیا ان انگلینڈ الیون کو شکست دی تھی۔ اس کے علاوہ بھی میں نے یہاں متعدد میچ کھیلے تھے۔ میں اس میدان کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ ہاں البتہ اگر کوئی شے تشویشناک تھی تو وہ تھی وکٹ ... جو پہلے کی مانند نہ تھی۔ موجودہ



بھارت کے دورہ میں پاکستانی ٹیم کا دہلی میں استقبال۔ فضل محمود اور نذر محمد ہار پہنے کھڑے ہیں بھارتی ٹیم کے کپتان اور کرکٹ کے نامور کھلاڑی لالہ امرناتھ جوشِ محبت سے نذر محمد کو دونوں ہاتھوں سے تھامے کھڑے ہیں۔

وکٹ دیکھنے میں تو کافی سخت معلوم ہوتی تھی مگر جب گیند ان سے ٹکر کھاتا۔ تو نہایت آہستگی سے اوپر کو اٹھتا۔ نتیجتہً تیز گیند پھینکنے والے کے لئے اس وکٹ پر کھیل کر خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنی تقریباً ناممکن تھی۔ بہر حال بانسہ پھینکا گیا اور نتیجے نے ہندوستان کی ٹیم کو پہل کرنے کا موقع دے دیا۔ بھارتی کھلاڑیوں نے سارا دن مسلسل کھیلنے کے بعد ۲۱۰ رنز کے عوض، کھلاڑی آؤٹ کرائے۔ اور اب ان کے صرف تین کھلاڑی باقی تھے۔ جنہوں نے اگلے دن کھیلنا تھا۔ صورت حال کا بغور جائزہ لینے کے بعد میرا اندازہ تھا۔ کہ کھیل کے اختتام تک ہندوستانی ٹیم کا کل اسکور ۲۵۰ سے زائد نہیں ہونے پائے گا۔ قصہ مختصر میں نے شام کو گراؤنڈ چھوڑنے سے قبل وکٹ کو پھر سے دیکھا تو اس پر ننھے ننھے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک ہی دن کے کھیل سے اس کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ وکٹ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے ایک گونہ اطمینان بھی ہوا۔ کیونکہ دوسرے دن کھیلنے والے بھارتی بیٹسمین کے لئے ایسی وکٹ پر کھیلنا جانکاہ مصیبت سے کم نہ تھا۔ بہر حال میں انہی خیالات میں کھویا ہوا اپنی ٹیم کے ہمراہ "سوس ہوٹل" پہنچا۔ اور آنے والے کل کے لئے

خود کو تیار کرنے لگا۔

میں نے وہ تمام رات کشمکش اور اضطراب میں گذاری۔ خدا خدا کر کے سپیدۂ سحر نمودار ہُوا۔ اور ہم وقتِ مقررہ سے کچھ دیر قبل ہوٹل سے روانہ ہوگئے۔ گراؤنڈ میں پہنچتے ہی میں نے معمول کے مطابق وکٹ پر نگاہ ڈالی۔ اور میں واقعی بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ وکٹ کسی نئی نویلی دلھن کی مانند بالکل صاف تھی۔ اور ہیٹ کی دستِ درازی سے قطعاً ناآشنا معلوم ہوتی تھی۔ اس پر ننھے ننھے گڑھوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جو گذشتہ کل جا بجا پڑے نظر آتے تھے۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ بھارت کی طرف سے رام چند اور ادھیکاری نے کھیل کا آغاز کر دیا۔ ان دونوں کے تیور تو یہی بتا رہے تھے کہ وہ جم کر کھیلیں گے لیکن رام چند کی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اور اسے فقط ۳ رنز کے عوض میدان کو الوداع کہنا پڑا۔ اس کے بعد نیئن نمودار ہوا۔ اور ۲۵ رنز بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ سب سے آخر میں غلام احمد برآمد ہوا۔ اور خیال تھا۔ کہ وہ جلد ہی آؤٹ ہو کر میرے کل والے قیاس کو

حقیقت میں تبدیل کر دے گا۔ مگر اس کے ساتھ ادھیکاری کا اشتراک آڑے آیا۔ اور انہوں نے ۱۰۰ رنز بنا کر کل اسکور ۲۷۳ تک پہنچا دیا۔ اور اس طرح ہندوستان نے ایک محفوظ مقام حاصل کر لیا۔

پاکستان کی طرف سے نذر اور حنیف محمدؔ میدان میں نکلے۔ اور دونوں کے تعاون نے ایک قلیل وقفے میں اسکور بورڈ پر پچاس رنز کی پلیٹ لگوا دی۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" اس گھڑی ہمارے لئے اتنا بھی غنیمت تھا چنانچہ ہماری کچھ ڈھارس بندھی۔ اور تماشائی بھی دل ہی دل میں اپنے قائم کردہ اندازوں کی خود بخود تردید کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نذر اور حنیف کے کھیل کو دیکھ کر اس وقت پورے وثوق سے کہا جا سکتا تھا۔ کہ اگر یہ دونوں کھلاڑی اسی گرمجوشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے تو "مدِ مقابل ٹیم کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ لیکن افسوس کہ رام چند کی طرح نذر کی آرزو بھی تشنہ تکمیل رہ گئی۔ اور اسے ۲۷ رنز بنانے کے بعد گراؤنڈ سے باول ناخواستہ رخصت ہونا پڑا۔ نذر کی واپسی کے وقت کھیل کے ختم ہونے میں تقریباً ایک

گھنٹہ باقی تھا۔ اور ہمارے کھلاڑی شکست سے بچنے کے لئے ہر ممکن سعی کر رہے تھے کہ پاکستان کی تین وکٹوں نے عین اسی وقت داغِ مفارقت دیا۔ جب کھیل ختم ہونے میں چند لمحات باقی تھے۔ نتیجتہً پاکستان کے حصے میں کل ۹۰ اسکور آ سکے۔ جس کے بعد کھیل کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ اور ہم سب نے "سوس ہوٹل" کی راہ لی۔

۷ تاریخ کی صبح کو ہم آخری بار فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ میں جمع ہوئے۔ اس روز ہماری ٹیم کا ہر فرد امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا نظر آتا تھا۔ اور سب پر اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ کیونکہ اول تو حالات بہت زیادہ مایوس کن تھے۔ دوسرے بھارتی باؤلنگ کا افتتاح ونو منکڈ کے ہاتھوں ہونا تھا۔ جس کی گیندوں کے سامنے ٹھہرنا ذرا دل گردے کا کام تھا۔ چنانچہ جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی! اور آتے ہی اس نے اپنی دہشتناک باؤلنگ سے ہمارے کھلاڑیوں کے حوصلے پست کر دئے۔ اس نے ۴۷ اوور کئے۔ اور ۱۵ رنز میں

آٹھ وکٹیں لیں۔ اور پاکستانی ٹیم کو صرف ۱۵۰ رنز پر اکتفا کر کے آؤٹ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال ہمیں ایک اور موقع دیا گیا۔ اور ہماری ٹیم دوبارہ فولو آن ہو گئی۔ منکڈ نے اب کی مرتبہ پھر شدید باؤلنگ کی۔ اور فوراً ہی ۵ وکٹیں ہتھیا لیں۔ اس کے علاوہ غلام احمد نے بھی بہترین باؤلنگ کا مظاہرہ کیا۔ اور ۳۵ رنز میں چار وکٹوں کا صفایا کر دیا۔ مختصراً یہ کہ ہماری ٹیم شام کو کھیل کا وقت ختم ہونے سے پیشتر ہی پھر ایک اننگ سے آؤٹ ہو گئی۔ "یہ تو بڑا معرکہ مارا۔" میں نے بات چھیڑنے کی خاطر نشتر زنی کی تاکہ بے گناہ انگلیوں کو کچھ دیر آرام کرنے کی مہلت مل جائے۔ جو مسلسل لکھتے لکھتے اینٹھنے لگی تھیں۔ "معرکہ تو مار ہی لیتے۔۔۔ لیکن چوٹ یہ ہوئی کہ حضرت پالنسہ کی کرمفرمائی نے بھارت کو پہل کرنے کا موقع عنایت کر دیا۔ اور یہی شے ان کی جیت میں حد درجہ معاون ثابت ہوئی۔" اس نے تپائی پر سے اپنا محبوب برانڈ گولڈ فلیک کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے ناول پیش کی۔ "مزید برآں۔۔۔۔ تھوڑی دیر کو رک گیا۔ دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ اس کے سگریٹ کے لب چوم رہا تھا۔ "منکڈ کی شخصیت ہمارے کھلاڑیوں کے لئے

خواہ مخواہ ہوّا بن گئی۔ اور ہمارے بیٹسمینوں نے ایک دم حوصلے ہار دیئے۔" اس نے بات کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے بیانیہ انداز میں کہا۔ اور فضا میں سیاہ و سفید دھوئیں کے مرغولے بکھیرنے شروع کر دیئے وہ جب بھی گیند پھینکنے لگتا۔ ہمارے بیٹسمین ڈر کے مارے وکٹ کے بالکل ساتھ لگ کر کھیلتے۔ اور اسے خوب کھل کھیلنے کا موقع بہم پہنچاتے .... اگر پاکستانی بیٹسمین منکڈ سے متاثر ہوئے بغیر اپنے اوسط کھیل کا مظاہرہ بھی کر جاتے تو بلاشبہ ہماری یہ درگت نہ بنتی۔" وہ بڑی سنجیدگی سے تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔" اس قدر خلافِ توقع انجام تو طبعِ نازک پر ضرور گراں گذرا ہوگا۔" میں نے شکست خوردہ کھلاڑی کے جذبات معلوم کرنا چاہے۔" ہار جانے سے تو ضمیر کو کیا دکھ ہوتا کیونکہ جیت کی طرح ہار بھی کھلاڑی کی زندگی کا جزو ہے۔ اس نے ایک لمبا کش لینے کے بعد جواب دیا۔ البتہ چند متعصب اور بے ہودہ تماشائیوں کے نازیبا سلوک سے جذبات بری طرح مجروح ہوئے۔" اور اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اصل واقعے سے کوئی تلخ و ترش یادیں وابستہ ہیں۔" ہوا کیا" میں

نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ہوا یوں" اس نے صوفے پر باقاعدہ لیٹتے ہوئے داستان کا آغاز کیا۔ اور میں نے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اور کم کر دیا۔ تاکہ کہانی سے پوری طرح لطف اندوز ہوا جا سکے۔"کرمیچ قریب الاختتام تھا" اس نے سگریٹ کے دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی پتلی سی لکیر پر نظریں جمالیں اور تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔ میں تکان سے چور پویلین کے بائیں کونے میں رکھے ہوئے ایک بہت بڑے لکڑی کے صندوق پر بیٹھا اپنے آخری کھلاڑی امیر الٰہی کے انجام کا منتظر تھا۔ کہ ایک باریک اور دلکش آواز کانوں سے ٹکرائی۔" وِشس یو گڈ لک" میں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ تو کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک حسین و جمیل ہندو دوشیزہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دایاں ہاتھ لہرا لہرا کر مجھے طنزاً "آشیرباد دے رہی تھی" اور فضل نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بقیہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر چھوڑ دیا۔" میں پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا اور اس قسم کے مذاق کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ لہٰذا مجھے سخت طیش آیا اور جی چاہا کہ منہ توڑ جواب دوں لیکن اس کا لڑکی ہونا آڑے آیا اور میں

خون کے گھونٹ پی کر پھر امیر الٰہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ خیال تھا کہ بلا ٹل گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی فقرہ فضا میں گونجا۔ بلکہ اب کی مرتبہ آواز بالکل قریب سے سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو محترمہ ہجوم کو چیر کر کافی نزدیک پہنچ چکی تھیں اور صندوق کے بالکل پاس جنگلے سے لگ کر پہلے کی طرح ہاتھ ہلانے میں مصروف تھیں۔ میں نے اس بار بھی صرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے پر اکتفا کی اور اپنی تمام تر توجہ امیر الٰہی کی طرف مرکوز کر دی۔ لیکن وہ پھر بھی باز نہ آئیں اور سہ بارہ یہی مشق دہرائی اور اب کی دفعہ ان کے ساتھ سینکڑوں مرد تماشائی بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو کر علی الاعلان میرا تمسخر اڑانے لگے۔ "کیوں . . . ؟ جیت لیا میچ" ایک صاحب نے گوہر افشانی کی . . . . ! اسی طرح کشمیر بھی لے لیں گے برخوردار" دوسری طرف سے آواز آئی اور یہ سن کر میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے ایک جست لگائی اور عین جنگلے کے پاس پہنچ کر للکارا۔ کہ اگر لکھنؤ پہنچتے ہی اس ہار کا بدلہ نہ چکایا تو فضل محمود نام نہیں"۔ اور یہ کہتے کہتے سچ مچ فضل کی مٹھیاں بھنچنے لگیں۔" میری یہ بات سن کر ہزاروں تماشائیوں نے

قہقہے لگائے اور جواب میں متعدد دیویوں نے خوب زور سے آوازہ کسا...... وِش یو گڈ لک بوائے۔ بٹ یو وِل نیور ون دی میچ"

کچھ دیر کے لئے فضا پر مکمل سکوت چھا گیا۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں ابھی تک بھنچی ہوئی تھیں۔ اور وہ صوفے پر ساکت وجامد لیٹا برابر خلا میں گھور رہا تھا۔ "پھر" میں نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔ "پھر کیا" اس نے انگڑائی کے ساتھ ساتھ جمائی بھی لیتے ہوئے کہا۔ "پھر ہم میچ ہار کر ٹھنڈے ٹھنڈے سوسِ ہوٹل کو چل پڑے اور لکھنؤ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں" ہوں "میں نے تھکے ہوئے انداز میں گہرا سانس لے کر کہا اور ایک بھرپور جمائی لے ڈالی۔

"انعام صاحب" فضل نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھانا چاہا "بس کر دیں" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے خود ہی فقرہ پورا کر دیا اور سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے کی نظر کر دیا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ" خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اطمینان سے لیٹے رہیے" میں نے مصنوعی سختی سے

کہا: "آپ کو تھوڑی سی ڈھیل ملی اور لگے فرار کی سوچنے......
خاکسار تو آج بھارتی دورہ مکمل کئے بغیر قطعاً پیچھا نہیں چھوڑے گا
میں نے قط اور عن پہ علیحدہ علیحدہ زور دیتے ہوئے کہا: "اور اگر
حضور کو کچھ شک ہے تو آج ہی آزما دیکھئے...... نہ سوؤں گا اور
نہ سونے دونگا" میں نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔
تاکہ لہجے میں تاثر کی کمی نہ واقع ہو جائے۔ فضل نے اس احتساب کے
خلاف شدید احتجاج کیا۔ اور میرا دل موم کرنے کے لئے آنکھوں
کی سرخی دکھانے کے علاوہ اعصابی تھکن کا تذکرہ بھی نہایت پُردرد
پیرائے میں بیان کیا۔ لیکن میں نے ایک نہ مانی۔ اور جوانمردوں کی طرح
ڈٹا رہا۔ میں اس کی "فطری کمزوری" سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے
علم تھا کہ کسی کی دل شکنی کرنا اس کے بس کی بات نہیں چنانچہ وہی
ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ یعنی کافی تکرار کے بعد وہ رضامند ہو گیا لیکن
اس شرط پہ کہ چائے پینے کے بعد لکھنا لکھانا شروع کیا جائے
اور وہ چائے بنوانے کے لئے بغلی کمرے کا دروازہ کھول کر اندرون
خانہ چلا گیا۔

ریلوے ہیڈکوارٹر کا گھڑیال نصف شب گذر جانے کی اطلاع دے رہا تھا۔ وقت کے احساس سے مجھے یکے بعد دیگرے جمائیاں آنے لگیں۔ میں صوفے سے اٹھا اور شغلِ بیکاری کے طور پر سامنے پڑی ہوئی تصاویر دیکھنا شروع کر دیں دائیں بائیں بیگم صاحبہ اور تین سالہ شاہد محمود بیٹھے مسکرا رہے تھے اور درمیان میں نیلی آنکھوں والا فضل محمود مجھے گھور رہا تھا۔ کافی دیر یونہی کھڑا رہنے کے بعد میں پھر صوفے پر آ بیٹھا۔ اور قالین کے خوشنما پھولوں سے لے کر چھت میں لگے پنکھے تک کا جائزہ لے ڈالا۔ جو موسم تبدیل ہو جانے کے باوجود کمرے کی زینت بنا ہوا تھا۔ فضا پر مکمل سکوت طاری تھا ہاں کبھی کبھار سڑک پہ سے گذرتا ہوا کوئی ٹرک پل بھر کے لئے اس سناٹے میں ضرور خلل انداز ہو جاتا۔ مجھے یوں چپ چاپ بیٹھے خاصہ عرصہ ہو چلا تھا۔ لہذا مجھ پہ بوریت کے دورے پڑنے لگے۔ اور اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ کہ بغلی کمرے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میری نظریں فوراً دروازے پہ جم گئیں وہ دونوں ہاتھ نائٹ گون کی جیبوں میں ڈالے برآمد ہوا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے اس کا

ملازم ہادی ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھامے پیالیوں کی کھنک سے ایک بے ہنگم شور پیدا کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور کمرے میں ایک مرتبہ پھر زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ "ہادی" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم اب جا کر سو جاؤ۔" پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "اپنی مدد آپ کیجئے اور چائے نوش فرمائیے۔" "بہت خوب" میں نے جواب دیا اور چائے بنانا شروع کر دی..... تھوڑی دیر کے بعد ہم چائے سے فارغ ہو گئے اور فضل نے آخری چسکی کے فوراً بعد سگریٹ سلگایا۔ اور صوفے پر نیم دراز ہو کر داستان کا آغاز کر دیا۔

دہلی سے فارغ ہو کر ہم ۲۰ اکتوبر کو لکھنؤ پہنچے تو بے شمار خطوط اور تاریں پہلے سے منتظر تھیں۔ سب سے اوپر بیگم صاحبہ کی تار تھی جس میں دہلی کی ہار پر اظہارِ تاسف کے بعد لکھنؤ ٹسٹ میں کم از کم سات وکٹیں حاصل کرنے کا شدید مطالبہ تھا۔ "بیگم صاحبہ کی تار" میں نے دانستہ متعجب ہو کر دریافت کیا۔ "مگر وہ آئیں کہاں سے؟" "ارے ہاں!" فضل چونکا۔ "میں یہ بتانا تو بھول

ہی گیا کہ ۱۶ جون، ۴۷ ۱۹ کو میری شادی اور خانہ آبادی دونوں ایک ساتھ ہو گئیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر عہدِ ماضی کی پہنائیوں میں کھو گیا۔" بقیہ تمام پیغامات بھارتی عوام کی طرف سے تھے اور سب میں یہی جملہ تحریر تھا۔

"وِش یو گڈ لک! بٹ یو وِل نیور وِن دی میچ...."

میں انہیں پڑھ کر سخت برافروختہ ہوا لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق دل مسوس کر رہ گیا اور مصمّم ارادہ کر لیا کہ جیتے جی اس ٹسٹ میچ کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ چنانچہ کاردار، امتیاز اور میر محمد حسین پر مشتمل انتخابی کمیٹی نے ٹیم کا انتخاب کیا۔ جس میں میرے علاوہ نذر، حنیف، امتیاز، محمود حسین، مقصود، وقار، کاردار، انور حسین، ذوالفقار اور امیر الٰہی شامل تھے۔ خان محمد بے چارے علالت کے سبب شرکت نہ کر سکے۔

مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۱ کو دلکش گومتی گراؤنڈ میں میچ کا آغاز ہوا۔ جسے دیکھنے کے لئے تقریباً بیس ہزار تماشائی جمع تھے۔ بھارت کی طرف سے امرناتھ، پی رائے، گائیکواڑ، گل محمد، مانجریکر، کشن چند،

آمرنگیر، جوشی، ایچ گائیکواڑ اور نہال چند نمائندگی کر رہے تھے
میچ شروع ہونے سے پہلے ٹاس پھینکا گیا اور دہلی کی طرح اس
مرتبہ بھی امرناتھ کی مراد بر آئی اور اس نے پی رائے گائیکواڑ کو میدان
میں نکالا۔ ہماری طرف سے محمود حسین نے پاکستانی باؤلنگ
کا افتتاح کیا اور باوجودیکہ اسے پہلی بار ٹسٹ میچ میں کھیلنے کا موقع
ملا تھا۔ اُس نے پوری تندہی اور جانفشانی سے اپنے فرض کو
نبھایا۔ اور شاندار باؤلنگ کا مظاہرہ کیا۔ اس کی پہلی ہی گیند پر
ایک کیچ نکلا لیکن بدقسمتی سے وقار حسن نے کھو دیا۔ بہرحال محمود
حسین نے انفرادی طور پر اپنا لوہا منوا لیا۔

محمود حسین کے بعد میں کھیلنے کے لئے نکلا تو میں نے کھیلنے
میں حد درجہ دِقت محسوس کی کیونکہ اس میچ میں کوئر میٹنگ کی
بجائے جیوٹ میٹنگ وکٹ کا انتظام تھا۔ مجھے اس قسم کی وکٹ
پر کھیلنے کا کوئی سابقہ تجربہ نہ تھا۔ اور میں ان دونوں وکٹوں کے
فرق سے بالکل لاعلم تھا۔ چنانچہ جب میں نے پہلی گیند حسب معمول گھما
کر پھینکی تو یوں محسوس ہوا جیسے گیند دبی تختے DEAD TURF پر پھینکی ہے۔

کیونکہ نہ تو گیند بسرعت گھومی اور نہ ہی تیز رفتاری سے بھاگی بلکہ وکٹ سے ٹکرا کر نہایت سُست روی سے پھسلتی ہوئی سیدھی نکل گئی اور سامنے کھڑے رائے نے بہ آسانی روک لی اور میں حیرانی کے عالم میں رائے کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ میں نے اسی الجھن میں متعدد بار گیند پھینکی مگر رائےٹس سے مس نہ ہوا۔ اور اگرچہ میں نے اسے ایک بھی ہٹ لگانے کا موقع نہ دیا تاہم وہ زِچ نہ ہو سکا اور میری ہر گیند بہ آسانی سے روک لیتا۔ حالانکہ میری لینگتھ اور ڈائرکشن سو فیصد صحیح تھی۔ میں نے اسی طرح تین اوور پھینکے اور بالآخر مسلسل ناکامی سے تنگ آکر ایک نیا طریقہ سوچا اور گیند صرف گھمانے کی بجائے اس کی سیون سے کام لینے کی ٹھانی۔ چنانچہ چوتھے اوور میں جب مانجریکر میرے بالمقابل آیا تو میں نے نئے حربے کا استعمال شروع کر دیا اور اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب گیند میری مرضی کے عین مطابق گھومی اور تیزی سے نکل کر مانجریکر کو پویلین کا راستہ دکھا گئی۔

مانجریکر کے بعد میں نے ہر کھلاڑی کو اسی طریقے سے گیند پھینکی

اور انہیں لپ پاکرتا چلا گیا۔ القصہ بھارتی ٹیم اپنی پہلی اننگ میں صرف ۱۰۵ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ ہیں نے اس دوران میں صرف باون رنز کا موقع دے کر بھارت کے پانچ کھلاڑیوں کو کھیلنے سے محروم کر دیا اور باؤلنگ آنرز حاصل کیے۔ محمود حسین نے ۳۵ رنز میں تین وکٹوں پر ہاتھ صاف کیا اور مقصود احمد کی جدّوجہد نے مبلغ دو عدد کھلاڑی واپس آرام گاہ میں بھیج دیے۔

پاکستان کی بیٹنگ کا آغاز حنیف اور نذر کے ہاتھوں ہوا۔ ان دونوں نے شام تک مسلسل کھیلتے ہوئے ۴۶ رنز بنائیں اور آؤٹ نہ ہوئے۔

اگلے روز مورخہ ۲۴ اکتوبر کو ہماری ٹیم تمام دن کھیلتی رہی۔ اور شام تک ۲۳۹ رنز بنالیں۔ نذر کی قسمت نے یاوری کی۔ اور وہ ۱۰۷ رنز بنا کر بھی "ناٹ آؤٹ" رہا۔ اس نے اپنے بے نظیر کھیل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ دنیا کے ممتاز کھلاڑیوں میں شمار ہو سکتا ہے۔

تیسرے دن یعنی ۲۵ اکتوبر کو پاکستان کرکٹ ٹیم ۳۳۱ رنز بنا کر آؤٹ ہوگئی۔ نذر محمد اس مرتبہ پھر جم کر کھیلا اور ۱۲۴ رنز بنانے کے باوجود ناٹ آؤٹ رہا۔ نذر اپنی غیر معمولی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اور جیت کے نشے میں سرشار جھوم رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسری اننگ میں جب ہم فیلڈنگ کرنے کے لئے گراؤنڈ میں جا رہے تھے۔ تو نذر نے مجھے چڑانے کے لئے کہا۔ کہ میری باؤلنگ اس کی بیٹنگ کے مقابلے میں ماند پڑ گئی ہے۔ میں بھی جوابی حملہ کرنے سے نہ چُوکا اور دعویٰ کیا کہ اگر ٹسٹ میچ کے سارے باؤلنگ آنرز نہ لئے تو مجھے فضل محمود نہ کہنا۔ اور خدا کے فضل سے مجھے نذر کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ کیونکہ میں نے شام تک مخالف ٹیم کے چھ کھلاڑیوں کو صرف چالیس رنز بنانے کی مہلت دی۔ اس دن ہندوستان کا کل سکور بمشکل ۷۰ تک پہنچ سکا۔ اور وہ بھی نو کھلاڑی دینے کے بعد..... پاکستان کی جیت یقینی ہو چکی تھی۔ کیونکہ اب صرف نہال چند سے نبٹنا

باقی تھا۔ مزید برآں ہندوستان کی دونوں اننگز کا اسکور بھی ہمارے ایک اننگ کے اسکور سے کم تھا۔

چوتھے دن یعنی پچیس تاریخ کو ہم آخری بار گومتی گراؤنڈ میں جمع ہوئے۔ اور بھارت کی طرف سے نہال چند بیٹنگ کے لئے آیا لیکن افسوس کہ اس بے چارے کو کھیلنا نصیب نہ ہوا اور وہ فقط ایک رن بنانے کے بعد میری گیند کی تاب نہ لا سکا۔ اور آؤٹ ہو گیا۔ اور پاکستان کرکٹ ٹیم ایک اننگ اور ۴۳ رنز کی اکثریت سے لکھنؤ ٹسٹ میچ جیت گئی۔ اس دن گراؤنڈ میں پچیس تیس ہزار کے قریب لوگ جمع تھے۔ انہوں نے میچ کے اختتام پر جس گندی ذہنیت کا ثبوت دیا اس کے تصوّر سے طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ بھارتی ٹیم کی شکست سے تماشائیوں کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور وہ غیظ و غضب کے عالم میں بھارتی کھلاڑیوں کے کیمپوں پر پل پڑے۔ اور انہیں آگ لگا دی حتےٰ کہ جس بس میں ان بے چاروں کو ہوٹل واپس جانا تھا۔ اس کے شیشے توڑ دیئے۔ اور کھلاڑیوں پر پتھر

پھینکنے شروع کر دیئے۔ اور وہ غریب بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔

۲۶ تاریخ کو مجھے بے شمار خطوط اور تاریں موصول ہوئیں جن میں ان تمام لوگوں نے جنھوں نے مجھے "وش یو گڈ لک" کے پیغام بھیجے تھے۔ لکھا کہ ہم اپنی آشیرباد واپس لیتے ہیں۔

"لکھنؤ ٹسٹ میچ کی جیت سے عوام کے قائم کردہ اندازے بدلنے لگے" فضل نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "سگریٹ پلیز" میں ایک بھرپور انگڑائی لے کر بولا۔ میری انگلیاں لکھتے لکھتے درد کرنے لگی تھیں اور دماغ معطل ہو رہا تھا۔ "یہ لیجیے" فضل نے پیکٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ اور میں سگریٹ کا پہلا کش لے کر پھر تیار ہو گیا۔ "ہاں جی" میں للکارا اور فضل سر کے نیچے ہاتھوں کی قینچی بنا کر پھر شروع ہو گیا "اس ٹسٹ میچ کے بعد یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ ٹسٹ میچوں میں جیت کس ملک کی ہو گی۔ کیونکہ

دہلی میں اگر بھارت نے پاکستان کو ہرا دیا تو لکھنؤ میں پاکستان نے بھارت کو شکست دے دی لہٰذا سب لوگوں کی نظریں بمبئی کے ٹسٹ میچ پر جم گئیں اور کرکٹ کے ہر سمجھ دار شائق کو یقین ہو گیا کہ بمبئی ٹسٹ میچ برابر رہے گا۔ کیونکہ بمبئی کے برابورن اسٹیڈیم کی وکٹ حد سے زیادہ سخت ہے اور باؤلنگ میں ذرہ بھر مدد نہیں دیتی۔ اسی لئے کرکٹ کے کھلاڑی اسے "بیٹسمینز پیراڈائز" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر ہم مؤرخہ ۱۳ نومبر کو برابورن اسٹیڈیم میں داخل ہوئے۔ اسٹینڈ کی طرف نگاہ دوڑائی تو انسانوں کا جمِ غفیر میچ دیکھنے کے لئے موجود تھا۔ بمبئی کرکٹ کمیٹی کے بیان کردہ اعداد کے مطابق تقریباً پچپن ہزار لوگوں کا اجتماع تھا جس میں سے نصف کے قریب مسلمان تھے وقت مقررہ پر میچ کا آغاز ہوا اور کاردار نے ٹاس جیت کر پاکستان کی طرف سے بیٹنگ شروع کرائی۔ ادھر سے بولنگ کے لئے امرناتھ نکلے اور آتے ہی "اِن سوِنگ" گیندوں کی بوچھاڑ سے ہمارے کھلاڑیوں کا ناک میں دم کر دیا۔ اور چھوٹے موٹے کھلاڑی

تو کُجا اُس نے نذر محمد کی بھی "ڈانڈیا گل کر دی" اور اُسے بمشکل چار رنز بنانے کی فرصت دی۔ امرناتھ کے علاوہ منکڈ نے بھی اپنے جوہر دکھائے اور حنیف کو فقط پندرہ رنز بنانے کا موقع دیا۔

اس اننگ میں پاکستانی ٹیم کی حالت انتہائی نازک تھی۔ اس وقت اگر کسی نے سہارا دیا تو وقار حسن تھا جس نے ۸۱ رنز بنا کر ہمارے دلوں کی دھڑکن بند ہونے سے بچا لی۔ وقار کے ساتھ ساتھ میں نے بھی اپنی قسمت کے طفیل ۳۳ رنز بنا لیں ورنہ درحقیقت میں ایک بھی رن کا مستحق نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں کافی مواقع ملنے کے باوجود خاطر خواہ اسکور نہ کر سکا۔ اسی دن میں نے جو شارٹ بھی کھیلا گیند فوراً کیچ کی صورت میں فیلڈر کے پاس پہنچ گئی اور وہ ہر بار کیچ کھوتا رہا۔ مجھے جب کبھی وہ منظر یاد آتا ہے تو میرا سر احساسِ ندامت سے جھک جاتا ہے کیونکہ میرے کھیل کے لحاظ سے وہ دن میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔ خیر قصہ کوتاہ یہ کہ ہماری کل ٹیم ۱۸۲ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ اس اننگ میں بھارت کی طرف سے امرناتھ نے اپنے فنّی کمال کا ناقابلِ فراموش مظاہرہ کیا اور ہمارے چار بہترین

کھلاڑی ناکام بنائے۔ منکڈ نے بھی اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ہماری تین وکٹیں گول کر گیا۔ رہی سہی کسر گپتے نے پوری کر دی اور ہمارے دو کھلاڑی اُسے دعائیں دیتے میدان سے باہر ہو گئے۔

ہمارے بعد بھارت کی پہلی اننگ شروع ہوئی اور دوسرے دن یعنی ۱۴ نومبر کی شام تک جاری رہی۔ اننگ کے اختتام سے کچھ عرصہ قبل امرناتھ نے اعلان کیا کہ وہ شام کو اپنی اننگ ختم کر دے گا۔ امرناتھ کے اس فیصلے کو اکثر کھلاڑیوں نے غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ کیونکہ ابھی کھیل کے دو دن باقی تھے اور نتیجہ اُمید کے برخلاف بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ لیکن امرناتھ نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ اُس کی دور رس نگاہ شاذونادر ہی دھوکہ کھا سکتی ہے۔ چنانچہ اننگ کے خاتمے میں جب پندرہ منٹ باقی رہ گئے تو اس نے دانی کے ہاتھوں نذر محمد کو کوئی رن بنائے بغیر آوٹ کرا کے پاکستانی بیٹنگ کو مفلوج کر دیا۔ نذر کا آوٹ ہونا تھا کہ ہمارے دل بجھ گئے اور ہمیں میچ ہاتھ سے جاتا دکھائی دینے لگا۔ اب شکست سے بچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ ہماری ٹیم دو دن

متواتر بیٹنگ کر کے میچ کو برابر رکھنے کی کوشش کرتی۔

نذر کے آؤٹ ہونے پر بھارتی اننگ ختم ہوگئی۔ بھارت نے اپنی اننگ میں بھی ہماری خوب پٹائی کی۔ انہوں نے اس دوران میں ۳۰۷ رنز بنائیں جس میں سے ۱۴۶ ہزارے اور ۱۰۲ امریگر کی محنت کا نتیجہ تھیں۔ میں نے اس اننگ میں ۳۹ ناکام اوور پھینکے اور بھارتی کھلاڑیوں کو ۱۱۱ رنز دے کر بھی ایک کھلاڑی پسپا نہ کر سکا۔

پندرہ تاریخ کو حنیف اور وقار نے کھیل شروع کیا اور آہستہ آہستہ کھیلتے رہے۔ انہوں نے اس روز جس انداز کی بیٹنگ کی۔ میں اسے کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا اور جس صبر و استقلال سے ان دونوں نے کام لیا وہ کچھ انہی کا حصہ تھا۔ وقار اور حنیف اسی طرح کھیلتے شام تک جمے رہے اور خیال تھا کہ یہ ابھی آؤٹ نہ ہوں گے کہ وقار کو ۶۵ رنز پر اکتفا کر کے میدان سے رخصت ہونا پڑا۔ وقار کو گئے بمشکل پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ کھیل ختم ہونے سے پانچ منٹ پیشتر حنیف بھی سنیچری کی حسرت دل میں لئے ۹۶ رنز بنا کر پویلین کو

چل دیا۔ ہم اس اننگ میں تین کھلاڑی گنوا کر ۱۰۶ رنز بنا سکے اور آنے والے کل کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے روز یعنی ۱۶ نومبر کو ٹسٹ میچ کا آخری دن تھا۔ ٹیم کے ممبران اور بیشتر تماشائیوں کو یقین تھا۔ کہ اب میچ برابر ہو جائے گا کیونکہ ہمارے ابھی سات کھلاڑی کھیلنے باقی تھے۔ چنانچہ کاردار اور امتیاز نے کھیلنا شروع کیا لیکن کاردار فقط تین رنز بنا پائے تھے کہ منکڈ کے ہاتھوں آؤٹ ہو گئے۔ امتیاز نے بھی بمشکل ۲۸ رنز بنائی تھیں کہ اسے گپتے نے لے لیا۔ اس دن منکڈ اور گپتے ہمارے لئے وبال جان بن گئے۔ اور انہوں نے ہماری کل ٹیم کو ۲۴۲ رنز عطا کر کے برابورن اسٹیڈیم کی آرام گاہ میں بھیج دیا۔ بھارت اب میچ تقریباً جیت چکا تھا کیونکہ اسے اپنی دوسری اننگ میں صرف ۴۰ رنز مطلوب تھیں جو ونو منکڈ اور آپٹے نے بہ آسانی بنا لیں اور جیت کا فیصلہ بھارتی ٹیم کے حق میں دے دیا۔

بمبئی میں شکست کھانے کے بعد ہمارے لئے سب سے اہم مسئلہ "ٹسٹ ربر" جیتنا تھا تاکہ پلہ برابر رہے۔ لہذا ہم سب نے ارادے مستحکم کئے اور ۲۸ نومبر کو مدراس شیپاک گراؤنڈ میں تیس ہزار تماشائیوں کے سامنے اس جوش اور اعتماد کے ساتھ کھیلے کہ اپنی پہلی اننگ میں ۴۴۸ رنز بنا کر ایک محفوظ مقام حاصل کر لیا۔

بھارت نے دوسرے دن چھ کھلاڑیوں سے ہاتھ دھونے کے بعد صرف ۱۷۵ رنز بنائیں اور ہماری کامیابی کا امکان روشن کر دیا۔ کھیل ابھی جاری تھا اور جیت ہر لحظہ ہمارے قریب آ رہی تھی۔ گراؤنڈ میں موجود ہر متنفس کو یقین ہو چلا تھا کہ پاکستان ٹیم چوتھا ٹسٹ میچ جیت جائے گی کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ ایک جھیل بن گئی اور لوگوں کا انبوہِ کثیر گھٹنوں تک پانی میں ڈوبا قدرت کی ستم ظریفی پر دل مسوس کر رہ گیا۔ اور منتظمین کو ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر بادلِ نخواستہ میچ کے خاتمے کا اعلان کرنا پڑا۔

اس وقت کیفیت یہ تھی کہ بھارت دو ٹسٹ میچ جیت چکا تھا ایک برابر رہا تھا اور ایک ہار چکا تھا۔ لہذا پاکستان کو "ربڑ" متوازن رکھنے کے لئے آخری ٹسٹ میچ میں کامیابی بہر قیمت مطلوب تھی۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر کو کلکتہ کی "ایڈن گراونڈ" میں میچ کا آغاز ہوا اور پاکستان ٹیم نے ٹاس جیت کر بیٹنگ شروع کی۔ ہم نے پہلے دن ۲۳۰ رنز بنائیں اور ہمارے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہوئے۔ نتیجہ کافی حوصلہ افزا تھا لیکن دوسرے دن جب ہماری ٹیم نے اپنی بقیہ اننگ شروع کی تو ماندہ پانچ کھلاڑیوں کو صرف ۲۷ رنز بنانے کی مہلت ملی اور وقت پورا ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان نے اپنا کھیل شروع کیا۔ اور پانچ کھلاڑی کھو کر اپنا اسکور ۱۷۳ رنز تک لے گئے۔

تیسرے دن کھیل شروع ہوا تو پھڈکر نے صرف ۵ رنز بنائیں حالانکہ وہ ہندوستانی کرکٹ کا دیرینہ رکن اور جانا پہچانا کھلاڑی ہے۔ اس کے مقابلے میں ڈی شودن نے سینچری بنا ڈالی۔ جسے ٹسٹ کرکٹ میں پہلی بار کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ مختصراً یہ کہ بھارت کی کل ٹیم ۳۵۰ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔

یہ پہلا ٹسٹ میچ تھا کہ جس میں مجھے سب سے زیادہ گیند پھینکنے کا موقع ملا۔ میں بھی اپنی قوتِ برداشت کا امتحان لینا چاہتا تھا لہٰذا میں بغیر کسی پس و پیش کے بھارتی اننگ میں متواتر گیند پھینکتا رہا۔ میں نے اس دن ۶۴ اوورز کئے اور ڈی شوون ایسی بلا سے بمشکل چھٹکارا پایا جو سینچری بنانے کے بعد بھی بس کرنے پر رضامند نظر نہ آتا تھا۔ اس دن اگر مجھے ۱۲۰ اوورز مسلسل بھی کرنے پڑتے تو میں یقیناً کوئی تکان محسوس نہ کرتا۔

بھارت پاکستان کی اننگ کے کل اسکور سے ۱۴۰ رنز زیادہ بنا چکا تھا۔ اور پاکستان کے لئے کسی معجزے کے بغیر میچ جیتنا ناممکن ہوگیا۔ حتیٰ کہ اس وقت ہمارے لئے پلّہ برابر رکھنا بھی دشوار ہوگیا جس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ۱۵ دسمبر کو ہم آخری بار "ایڈن گراؤنڈ" میں جمع ہوئے اور کھیل کا آغاز کر دیا وقار حسن نے ایک دفعہ پھر بے نظیر اننگ کھیلی اور ۹۷ رنز بنا کر میچ کو برابر کرنے میں انتہائی مدد دی۔ پاکستان ٹیم اپنے سات کھلاڑی دے کر ۲۳۶ رنز بنانے میں کامیاب ہوگئی اور اختتام پر یہ میچ برابر ہوگیا لیکن

"ٹسٹ دبہ" پھر بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔

میں ان تمام ٹسٹ میچوں کی اوسط میں اوّل رہا۔ میں نے ۲۲۹ اوور کیے جن میں سے ۷۶ میڈن رہے۔ ۵۰۰ رنز دیں اور ۲۰ وکٹیں حاصل کیں اور اوسط ۲۵٫۴۴ رہی میرے علاوہ محمد حنیف بھی اس دورہ میں کافی کامیاب رہا۔ ہم دونوں کے کھیل سے متاثر ہو کر بھارت کے عظیم کھلاڑی وجے مرچنٹ اور مہاراج کمار وزیانگرم نے پاکستانی ٹیم کے بھارتی دورے پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ "فضل اور حنیف دنیا کی ہر کرکٹ ٹیم میں رکنیت حاصل کر سکتے ہیں۔"

دورے کے اختتام پر ہم کلکتہ سے بذریعہ ہوائی جہاز مشرقی پاکستان اور برما کا چکّر لگاتے ہوئے ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کی شام کو تقریباً ۶½ بجے کراچی کے ہوائی اڈے پر اُترے جہاں ہزاروں پاکستانیوں نے ہمارا پُرجوش استقبال کیا۔ طیارے سے نیچے آیا تو ہر کوئی مجھ سے بغلگیر ہونے کو بے چین نظر آتا تھا۔ میں تھکاوٹ

کے سبب ایسے گرمجوش خیر مقدم کے قطعاً ناقابل تھا۔ لہٰذا ہجوم سے گھبرا کر میں نے سامان وہیں چھوڑ کر ایک لمبی دوڑ لگائی اور الانگتا پھلانگتا باہر سڑک پر آگیا جہاں اتفاقاً ایک دوست کی کار مل گئی اور میں نے ہوٹل میٹروپول پہنچ کر دم لیا۔ ابھی میں صدر دروازے سے گذر کر چند ہی قدم چلا تھا کہ آئی۔ جی۔ پولیس میاں انور علی صاحب مل گئے اور مبارکباد دینے کے بعد بتایا کہ مجھے ترقی دے کر میرا تقرر بطور ڈی۔ ایس۔ پی ہیڈکوارٹرز منٹگمری کر دیا گیا ہے۔ ترقی کی خبر میرے لئے دوگونہ خوشی کا باعث ہوئی اور میں اطمینان سے دو تین روز کراچی میں گذار کر لاہور چلا آیا لاہور پہنچتے ہی خان قربان علی خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے مجھے منٹگمری جانے کے باضابطہ احکام صادر فرمائے اور میں نے ایک ہفتہ بعد اپنے نئے عہدے کا چارج لے لیا۔“

آخری جملہ کہنے کے بعد فضل آہستہ سے اٹھا اور بولا ”کیوں جی ہو گئی طبیعت صاف؟“ اور نیند کے غلبے سے میں کوئی

جواب دیئے بغیر فائل بغل میں داب اسے شب بخیر کہہ کر لڑکھڑاتے
قدموں سے باہر نکل آیا۔ نیم تاریک اقبال روڈ سنسان پڑا تھا
اور سردی سے منجمد برقی کھمبے خاموش کھڑے فضا کو اور بھی پُر اسرار
بنا رہے تھے۔ میں چوک میں کھڑے گشتی سپاہیوں کی نگاہ سے بچتا
بچاتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اور جب میں کپکپاتا ہوا گھر
پہنچا تو ریلوے ہیڈ کوارٹرز کا گھڑیال تین بجا رہا تھا۔

دس گیارہ اور بارہ کو فضل محمود کی مصروفیات پھر سدِّ راہ ثابت
ہوئیں۔ تیرہ کو ریڈ کراس فنڈ جمع کرنے کے لئے باغ جناح میں
کرکٹ میچ تھا جس میں فضل کو بھی شرکت کرنی تھی۔ ناچار مجھے
باغِ جناح کا رُخ کرنا پڑا اور گیٹ کیپر کو جھانسا دے کر اندر چلا گیا
تماشائیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ بمشکل تین چار ہزار لوگوں کا
اجتماع ہوگا۔ میں پویلین کے برآمدے میں سے ہوتا ہوا سید حاجمخانہ
ٹینٹ میں چلا گیا۔ فضل گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ اگلی رَو میں
بیٹھا میچ کا نظارہ کرنے میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھ کر اُٹھا اور ہم

دونوں سب سے الگ پچھلی رو کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے

"آپ نہیں کھیلیں گے آج" بیگم فضل نے پیچھے مڑ کر دریافت کیا

"آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھے کل رات سے شدید زکام ہے

جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے" اور اس نے رومال ناک پر رکھ کر سوں سوں

شروع کر دی "تھوڑا تھوڑا بخار بھی ہے" اس نے باآواز بلند اپنی

علالت کے بیان میں مزید اضافہ کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر ہولے

سے بولا "یہ سب جھوٹ ہے"

"جی" میں حیرت سے بولا "اصل بات یہ ہے کہ اپنی ٹیم کمزور

ہے اور مقابلے پر میاں صاحب کھیل رہے ہیں" "پھر کیا ہے" میں

نے تعجب سے پوچھا "پھر یہی ہے کہ وہ مار مار کر میری ٹیم کا بھرکس

نکال دیں گے اور خاکسار کی کرکری ہو گی۔ میں اکیلا کیا کروں گا"

اس نے سرگوشی میں کہا اور ساتھ ہی زور سے "آہ" کا نعرہ لگایا اور بیگم صاحبہ

کے دکھاوے کو ایک بھرپور انگڑائی لے لی۔ میچ اگرچہ دوستانہ تھا۔

پھر بھی بیگم فضل پورے انہماک سے دیکھ رہی تھیں اور مجھے ان کی

بے بسی پہ ہنسی آ گئی۔ اگر شوہر نامدار شکست کھا جائیں جب بھی

ندامت اور اگر والدِ محترم جیبت سے ہاتھ دھو بیٹھیں تو بھی ڈشکنی کا سامان۔" ہاں جی" میں نے گرد وپیش کا جائزہ لینے کے بعد فضل کو متوجہ کرنا چاہا اور جواباً اس نے بھی یہی الفاظ دوہرا دیئے "آپ نے گذشتہ نشست میں بطور ڈی۔ ایس۔ پی۔ منٹگمری ہیڈکوارٹرز کا چارج لیا تھا" میں نے اسے یاد دہانی کرائی۔" لیا تو تھا۔" فضل بے توجہی سے بولا اس کی نظریں میدان پر جمی ہوئی تھیں جہاں اس کی ٹیم باؤلنگ کر رہی تھی۔" اپنی ٹیم مار کھائے ہی کھائے" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اس نتیجے پر پہنچ کر اس نے یکسوئی کے ساتھ لکھوانا شروع کر دیا۔" قیام منٹگمری کے دوران ہی جسٹس کارنیلیس نے مطلع کیا کہ مجھے ۱۹۵۳ کے وسط میں پاکستان ایگلٹس کے قائد کی حیثیت سے انگلستان کے سابق فاسٹ باؤلر الیف گوور سے تربیت حاصل کرنے کے لئے لندن جانا ہو گا۔ بورڈ کے اس فیصلہ سے اکثر لوگوں نے اتفاق نہ کیا اور ان کے خیال میں مجھے پاکستانی ٹیم کے ہمراہ سرکاری دورۂ انگلستان سے قبل کھلاڑیوں کو اپنے کھیل سے روشناس ہونے کا موقع دینا

انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ میں نے یہ بات سنی اَن سنی کر دی اور اپنے گذشتہ تجربات کی بنا پر انگلستان جانے کا ارادہ مستحکم کر لیا تاکہ وہاں کی گراؤنڈ اور وکٹ کا جائزہ لیا جا سکے اور موسم کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملے جو کھیل کے دوران میں خاص تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ میری متجسس طبع کا شدید تقاضا تھا کہ میں آسٹریلیا اور انگلستان کے درمیان ہونے والے میچ دیکھ کر ان کے کھیل کا معیار اور نوعیت معلوم کروں۔ چنانچہ ان تمام مقاصد کے پیش نظر میں جانے پر رضامند ہو گیا اور مستقبل کے نتائج نے ثابت کیا کہ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ میں نے تربیت کے دوران میں جو بھی کچھ دیکھا یا سیکھا انگلستان کے ساتھ ٹسٹ میچ کھیلتے ہوئے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔"

"تڑ تڑ تڑ تڑ۔ تڑ.........." فضا میں تالیوں کا شور بلند ہوا۔ مخالف ٹیم کے کپتان میاں سعید ایک یادگار ہٹ لگا کر رنز بنا رہے تھے فضل ایک دم اٹھا اور زور سے چلّایا۔ "شاباش مائی بیٹ" مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میاں صاحب کے ہاتھ میں فضل کا بیٹ تھا جو وہ انگلستان سے لایا تھا۔ تالیوں اور قہقہوں کا ہنگامہ کچھ کم ہوا

تو فضل پھر سے متوجہ ہو گیا" جسٹس کارنیلیس کا پیغام سن کر میں
۱۹۵۳ کے موسم گرما کا انتظار کرنے لگا چنانچہ ۱۹۵۳ کے اوائل
یعنی مارچ کے مہینے میں مجھے محکمہ کی طرف سے ڈیوٹی پر تصور کرتے ہوئے
انگلستان جانے کی اجازت مل گئی اور اسی پر بس نہیں بلکہ میرے
محکمہ نے عنایت خسروانہ سے کام لے کر مجھے ایک ہزار روپے کی رقم
بھی عطا کی تاکہ میں آسانی سے انگلستان کے اخراجات برداشت
کر سکوں چنانچہ جملہ انتظامات مکمل کرنے کے بعد میں سات جون
کو علے الصبح چار بجے کے قریب کراچی کے ہوائی اڈے سے بذریعہ
طیارہ پرواز کر گیا اور بحرین جا اترا۔ وہاں ایک گھنٹہ قیام کرنے کے
بعد ایتھنز پہنچا اور پرنسس ہوٹل میں شب بسر کی۔ آٹھ تاریخ کی صبح
کو اسی" سکنڈنیوین جہاز میں روم سے ہوتا ہوا جینوا اور پھر شام
پانچ بجے کے قریب لندن کی سرزمین پر جا اترا ہوائی مستقر سے نکل کر
میں نے سیدھا" شیر ووڈ ہوٹل" واقع ہٹنی کا رخ کیا جہاں پاکستان
انگلینڈ کی ٹیم کے بقیہ ارکان مقیم تھے۔ ہوٹل پہنچا تو سب کھلاڑی
بڑے تپاک سے ملے اور رات گذارنے کے بعد ہم لوگ ۹ تاریخ

کی صبح کو ایلف گوور کے تربیتی سکول واقع ورڈزورتھ ٹاؤن میں جاکر اس سے ملے۔

ایلف گوور کا اسکول ایک "ان ڈور" تربیت گاہ ہے اور زیادہ تر موسم سرما میں کارآمد ہے جب انگلستان میں برفباری شروع ہوتی ہے اور کھلاڑی کھلے میدانوں میں مشق جاری نہیں رکھ سکتے۔ ایلف گوور نے ایک بہت بڑے ہال میں کل تین نیٹس لگائے ہوئے ہیں اور ہر وکٹ ایک، دوسری سے مختلف ہے۔ وکٹ نمبر ۱ ایسی وکٹ ہے جس پر گیند بسرعت گھومتی ہے۔ وکٹ نمبر ۲ پر گیند کم گھومتی ہے اور وکٹ نمبر ۳ پر گیند تیزی سے گھومتی اور سیدھی رہتی ہے۔ ہال کے اندر برقی روشنی کا مکمل انتظام ہے اور اگر کوئی چاہے تو دن رات مشق کر سکتا ہے۔

اسکول کی سیر کرنے کے بعد ہماری ٹیم نے بھی ایلف گوور کی نگرانی میں مشق شروع کر دی اور وہ کھلاڑیوں کو مناسب موقعوں پر ہدایات دیتے رہے۔ ابھی مشق کرتے دو ہی دن گذرے تھے کہ پاکستان ایگلٹس کو ایلف گوور کی قیادت میں رائل ایئر فورس

کی ٹیم سے کھیلنا پڑا۔ مخالف ٹیم کی رہنمائی آر۔ اے۔ الیف کے کپتان شیرف کے ذمے تھی جو کینٹ کاؤنٹی کی طرف سے کھیلتا ہے اور ٹیم میں انگلستان کا سب سے فاسٹ باؤلر" فریڈی ٹروین" بھی شرکت کر رہا تھا جس نے بعد ازاں اوول کے میدان میں آسٹریلوی ٹیم کو پسپا کرنے میں کافی مدد دی۔

یہ میچ مرکزی لندن سے تقریباً دس میل دور "کنگسٹن ایتھمنز" کی گراؤنڈ میں تین دن جاری رہا اور خاتمے پر ہماری ٹیم ۱۰۹ رنز سے ہار گئی۔ میں اپنی پہلی اننگ میں ۲۱ رنز بنا کر "ناٹ آؤٹ" رہا اور دوسری اننگ میں ۴۹ رنز بنانے میں کامیاب ہوا۔

پاکستان ایگلٹس ایک مہینہ ٹریننگ لیتے رہے۔ میں نے اس دوران میں متعدد بار ایلف گوور سے نئی ہدایات لینے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے "ان سوئنگ" اور "آؤٹ سوئنگ" سکھانے کے بعد صاف طور پر کہہ دیا کہ میرے پاس اور کوئی فنی نکتہ ایسا نہیں جو تمہاری باؤلنگ میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ چنانچہ کوئی مہینہ بھر کے بعد ہم لوگ انگلستان کے شمال کی طرف ویلز میں چلے گئے اور وہاں

کی مقامی کلبوں کے ساتھ میچ کھیلتے رہے۔ پاکستان ایگلٹس کا آخری میچ ۱۹ اگست کو ہوا جس میں ویسٹ انڈیز کے ان تمام اچھے اچھے کھلاڑیوں کو اکٹھا کر کے جو انگلستان "لیگ کرکٹ" کے پیشہ ور کھلاڑی ہیں۔ ایک "ویسٹ انڈیز" گروپ بنایا گیا۔ جس میں مارٹن ڈیل۔ فرینک وورل۔ ایورٹن ویکیس۔ مارشل ولینٹائن اور کیپن چرڈ ایسے ٹسٹ کھلاڑی شامل تھے۔

یہ ایک روزہ میچ میری قیادت میں ایلیبیوویل کی گراؤنڈ میں کھیلا گیا اور اسے دیکھنے کے لئے کم و بیش دس ہزار تماشائی جمع تھے۔ پاکستان ایگلٹس نے اپنی پہلی اننگ میں ۲۳۰ رنز بنائیں اور ہمارے تین کھلاڑی آؤٹ ہوئے۔ اس دوران میں اسلم اور میں بالترتیب ۵۵ اور ۱۰۴ رنز بنا کر "ناٹ آؤٹ" رہے۔ ویسٹ انڈیز والوں نے اپنے پانچ کھلاڑی کھو کر ۱۰۷ رنز بنائیں اور وقت ختم ہونے کے باعث میچ برابر ہو گیا۔ میں نے اس دن "ویسٹ انڈیز" کے چار بیٹس مین آؤٹ کئے جن میں سے تین مارشل ویکیس وورل اور موسیڈک ایسے نامور بیٹس مین تھے۔ میں نے اس دورے میں کل اٹھارہ

میچ کھیلے اور ان میں ۹۳ وکٹیں حاصل کیں اور ۱۳ ۱۷ رنز بنائیں۔"
"گڈ بیٹ" فضل پھر چیخا اور کرسی سے اٹھ کر اپنے بیٹ کو بے تحاشا
داد دینی شروع کر دی۔ میاں سعید فضل کی ٹیم کی خوب اچھی طرح
مرمت کر رہے تھے۔ کھیل کا مسلسل مشاہدہ کرتے بیگم فضل بھی معاملے
کی تہہ تک پہنچ گئیں اور فضل کو مخاطب کر کے بولیں "میں بھی کہوں
کپتان صاحب کی طبیعت کیوں ناساز ہے۔ میدان میں جاتے
ہوئے خوف محسوس ہوتا ہوگا۔" "قسم خدا کی کیا بیٹ پایا ہے۔"
فضل نے دانستہ سنی ان سنی کر دی اور بیگم صاحبہ کو چڑانے کے
لئے پھر بیٹ کی تعریف شروع کر دی "گیند کو وکٹ کی جانب جانے
ہی نہیں دیتا۔ ہٹ پہ ہٹ لگائے جا رہا ہے۔ ولائتی ہے نا۔"
اور پھر بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے میدان کی طرف دیکھنا شروع کر
دیا۔ "میاں صاحب آج گراؤنڈ سے واپس جاتے نظر نہیں آتے"
اس نے آہستہ سے کہا۔ اور اٹھ کر اسکور بورڈ کی طرف دیکھنا شروع
کر دیا۔ اسی اثنا میں نو دس بچے آ گئے اور فضل سے آٹوگراف کا
مطالبہ کرنے لگے۔ فضل نے ہر ایک کی کاپی پر دستخط کر دیئے اور انہیں

بہلا پھسلا کر ٹینینٹ سے باہر بھیج دیا کیونکہ وہ اسکریپ بک میں سے تصاویر دیکھنے کے لئے بھی مچلنے لگے۔ "ہاں جی" اس نے اپنی تمام تر توجہ میری طرف مرکوز کردی "آپ ایلف گوور کی زیر نگرانی کھیلے ہوئے اٹھارہ میچوں میں حاصل کردہ وکٹوں اور رنز کی تعداد بتا رہے تھے" میں نے خلاصہ بیان کر دیا۔ "ہوں"۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور آنکھیں میچ کر کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

"اسی دوران میں انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان اوول کی گراؤنڈ میں آخری ٹسٹ میچ ہو رہا تھا" اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں پاکستان سے اس میچ کو دیکھنے کی تمنا لے کر چلا تھا"۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ غالباً وہ اوول کی گراؤنڈ میں پہنچ گیا۔ "لہٰذا میں سارا عرصہ اوول کی گراؤنڈ میں موجود رہا اور ہر دو ملکوں کے انداز کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ کھیل کے آخری دن بھی میں وہیں تھا اور نتیجے کا انتظار کر رہا تھا چنانچہ یہ میچ آٹھ وکٹوں سے انگلستان کے حق میں دوپہر کو ختم ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزوں نے اپنی "ہوم گراؤنڈ" پر آسٹریلیا کو شکست دی اور ایشز بھی اڑے

انگلستان کی اس شاندار اور تاریخی کامیابی پر انگلستانی عوام جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ چنانچہ میچ کا ختم ہونا تھا کہ ہزاروں تماشائی دیوانہ وار پویلین کی طرف لپکے اور ایک جگہ جمع ہو گئے۔ چند ثانئے بعد فتحیاب کپتان "لین ہٹن" مسکراتا ہوا اپنی بالکنی پر آیا اور لوگوں نے "تھری چیئرز" "تھری چیئرز" کے فلک بوس نعرے لگانے شروع کر دیئے اور ہٹن جیت کے نشے میں سرشار ہاتھ لہرا لہرا کر پبلک کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اور وہ عجیب شانِ بے نیازی سے کھڑا مستانہ وار اپنا ہاتھ فضا میں بار بار لہرا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ساری دنیا کا فاتح ہے جس کے سامنے انسانوں کا انبوہِ کثیر سجدہ ریز ہے میدان میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ نعروں، چیخوں اور سیٹیوں کے بے ہنگم شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں خود بھی "ہپ ہپ ہرا" کے نعرے لگا رہا تھا۔ بالکنی پہ کھڑے ہٹن کی شخصیت مجھ پہ چھائی جا رہی تھی اور میں اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "کتنا خوش قسمت ہے یہ انسان" میں نے سوچا اور معاً

میرے دل میں ایک نئی آرزو نے جنم لیا۔ مجھے یکایک خیال آیا کہ
آئندہ سال مجھے بھی ہٹن کے مدِمقابل کھیلنا ہے۔ اس ہٹن کے
مقابلے پر جو اپنے فن میں منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ جس نے آج
کرکٹ کے خداوندوں کو شکست فاش دے دی۔ جسے انگلستان کے
عوام "ماسٹر لین ہٹن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جس کی آمد پر لوگ
جوشِ عقیدت سے سرنگوں ہو جاتے ہیں جو آج فاتح اوّل کی
صورت میں کھڑا ہزاروں شیدائیوں سے خراجِ تحسین حاصل کر
رہا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ کل کو میں اسے ہٹا کر اس بالکنی
پر خود کھڑا ہو جاؤں۔ خوشی سے دیوانے لوگوں کی نگاہیں میرے
چہرے کا تعاقب کر رہی ہوں اور میں بھی اسی طرح کھڑا شانِ
استغنائی سے فضا میں ہاتھ لہراؤں۔ ۔ ۔ ۔ میں انہی تصورات
میں کھویا ہٹن کو دیکھے جا رہا تھا۔ احساس کامرانی سے اس کا سر
بلند تھا۔ اس کے لبوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور اس کا ہاتھ
بار بار اس کی عظمت کا ثبوت دے رہا تھا۔ میں اسی طرح خیالات
کی رو میں بہتا منتشر ہجوم کے ساتھ میدان سے باہر نکلا اور واپس

ہوٹل چلا گیا۔ میرے کانوں سے ابھی تک ان نعروں کی گونج ٹکرا رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اب تک ہٹن کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا لہراتا ہوا ہاتھ میرے لئے نشانِ منزل بن گیا۔ اور میرا دماغ آئندہ کے لئے لائحہ عمل سوچنے لگا۔ میں نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ میں اگلی مرتبہ یہاں آیا تو اوّل ہیرو کی حیثیت میں وطن لوٹوں گا تاکہ پاکستان کرکٹ ٹیم کا دورۂ اوّل ہی اپنے تعارف کے لحاظ سے حرفِ آخر ثابت ہو میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا صرف اس لئے کہ میرا تخیّل حقیقت کا روپ دھار سکے۔ چنانچہ میں مجسّم آرزو بن کر ۲۶ اگست کو انگلستان کی سرزمین سے رخصت ہو گیا اور سمندر کے راستے کانٹینینٹ کا چکر لگاتا خاصی مدّت کے بعد ساحلِ کراچی پر اُترا۔ اسی اثنا میں میری تبدیلی لاہور چھاؤنی ہو چکی تھی۔ لہٰذا سیدھا لاہور پہنچا اور آتے ہی شبانہ روز مشق کو معمول بنا لیا اور دورانِ مشق ان تمام نئی ہدایات کو پیشِ نظر رکھا جو ایلف گوور سے ملی تھیں اور اس طریقے سے گیند اندازی شروع کی جس طریقے سے میں نے اپنے سرکاری دورے میں کھیلتے ہوئے

کام بینا تھا۔" فضل کی آنکھیں اب تک نیم وا تھیں۔ وہ غالباً ماضی کی حسین اور درخشندہ یادوں میں کھویا اور دل کی وسیع اور دلکش گراؤنڈ میں کھڑا بے شمار لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور میں اُسے اِسی کیفیت میں چھوڑ کر الوداع کہہ آیا تاکہ زندگی سے ابدی جنگ کرنے والا فضل تھوڑی دیر کو سستالے۔

چودہ کو اتوار تھا لیکن فضل میچ میں شرکت کرنے کے سبب وقت نہ نکال سکا پندرہ کو مجھے ذاتی مصروفیات نے فرصت نہ دی اور یوں دو دن ضائع چلے گئے۔ ۱۶ کو اس کی قیام گاہ پہ پہنچا تو وہ متعدد ملاقاتیوں کے نرغے میں تھا کیونکہ اگلے روز اسے عازم پشاور ہونا تھا ڈھائی تین گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد اسے پل بھر کو تنہائی نصیب ہوئی تو میں اسے اغوا کر کے مکتبۂ دار البلاغ کی طرف چل دیا۔ جہاں کسی کے مخل ہونے کا امکان نہ تھا۔ رات کے تقریباً دس بجے ہوں گے جب میں خواجہ صاحب کے مکان پہ کھڑا برقی گھنٹی کا بٹن دبا رہا تھا: "خواجہ صاحب کا مکان یہ ہے یا سامنے والا" فضل اندھیرے

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ رہائش گاہ ہے وہ مکتبہ جہاں آپ نے دعوت اڑائی تھی۔" میں نے اس کا شک رفع کرتے ہوئے کہا۔ "ہوں۔" وہ مطمئن ہو گیا اور سفید مفلر سے سینہ ڈھانپ رین کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تاریک اور سنسان گلی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ "کون" اوپر سے مبین کی آواز آئی۔ "انعام" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ چند ثانیے بعد صدر دروازے کی بیرونی بتی روشن ہوئی اور چٹخنی گرنے کی آواز کے فوراً بعد خواجہ صاحب شب خوابی کے لباس میں برآمد ہوئے۔ "اسلام علیکم احضرات" انہوں نے مسکراتے ہوئے نعرہ لگایا "خیریت تو ہے" وہ مصافحہ کرتے ہوئے بولے "خیریت ہوتی تو اتنی رات گئے آپ کو کیوں تکلیف دیتے۔" فضل نے بڑی سنجیدگی سے کہا جیسے واقعی کوئی واردات ہو گئی ہو اور ساتھ ہی آمد کا مدعا بیان کر دیا۔ اور خواجہ صاحب ایک دم ہنس پڑے۔ "یہ انعام صاحب بھی آپ کو چھوڑنے کے نہیں جب تک آپ داستان ختم نہ کر دیں۔" انہوں نے مکتبے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "توبہ ہے خواجہ صاحب! انہوں نے تو میرا جینا

اجیرن کر دیا ہے۔ اکثر اوقات آدھی آدھی رات تک سونے نہیں دیتے۔" فضل میرے پیچھے پیچھے مکتبے میں داخل ہوتے ہوئے ازراہِ شرارت بولا۔ اور ہم دارالبلاغ کے وسیع اور کشادہ صحن میں سے گزر کر اسٹاک روم سے ملحقہ پرسکون دفتر میں جا پہنچے اور خواجہ صاحب مہمان نوازی کے فرائض کی بجا آوری کے لیے اجازت دے کر واپس مکان میں چلے گئے۔ "یہ تو اچھی خاصی آرٹ گیلری ہے۔" فضل نے دیواروں پر آویزاں فنِ مصوّری کے شاہکاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ خواجہ صاحب کی ذاتی کولیکشن ہے کیا؟" اس کی نگاہیں "خوابِ جوانی" کی مستِ شباب رقّاصہ پر مرکوز تھیں جو گھٹاؤں کے سائے میں مدہوشی کے عالم میں محوِ رقص تھی۔ "کولیکشن نہیں بلکہ یہ تمام دارالبلاغ کی شائع کردہ کتب کے اصل سرورق ہیں جنہیں مصوّر سے بنوا کر فریم کرا لیا گیا ہے۔"

"خوب۔" وہ چشمِ لیلیٰ پر نظریں جمائے بولا۔ اور پھر گھوم کر تمام کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ "پی کہاں...... راوی کے دامان ...... میری کہانی۔" اور وہ چلتا چلتا رک گیا۔ چترِ کار دیکھیے کی قلمکاری نے ایک کھلاڑی کو بھی چند لمحوں کے لیے پابہ زنجیر کر دیا اور وہ کافی

عرصہ تک راج محل میں بیٹھی راج کماری کو دیکھتا رہا جس کی آغوش میں لیٹا ہوا آنند کا ماتا راجکمار دنیا و مافیہا سے بے خبر رنگین خوابوں کی حسین وادیوں میں گامزن تھا۔ اور میں سوچنے لگا کہ فن واقعی ایک ٹھوس حقیقت ہے بشرطیکہ فنکار نے خلوص اور جگر کاوی سے کام لیا ہو۔ "ساون۔ شفق" وہ قدم قدم بڑھتا جا رہا تھا۔ "ہر طرف رومان ہی رومان بکھرا ہوا ہے" اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ "جی ہاں" میں مسکرایا۔ "مگر ساتھ ہی "اشکِ ندامت" اور "در توبہ" بھی ہے۔" میں نے دو شاہکار مرقعوں کی طرف اشارہ کیا۔ "باپ رے" وہ بیساختہ بولا۔ "اور اگر آپ پھر بھی باز نہ آئیں تو آخر میں جہنم بھی موجود ہے" میں نے فقرہ چست کیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "جب تو خواجہ صاحب نے ہر قسم کا انتظام کر رکھا ہے" اور یہ کہہ کر فضل میرے ساتھ والے صوفے پر آ بیٹھا۔ میں نے اسی اثنا میں فائل نکالی اور کاغذات ترتیب دینے لگا۔ "خدا کے لئے کچھ دیر تو ٹھہر جائیے۔" فضل گلوگیر آواز میں بولا۔ اور خواجہ صاحب کی بروقت آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ان سے محوِ کلام ہو گیا۔ "آپ نے تو حد کر دی تکلف کی۔"

وہ پلیٹ میں رکھے سرخ سرخ سیبوں کو دیکھ کر لعاب دہن سے حلق تر کرتے ہوئے بولا "میں جانتا تھا کہ حضرت دل پہ پتھر رکھ کر یہ سب کچھ فرما رہے ہیں ورنہ سیب تو ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔" ایسے نازک وقت پر تشریف لا کر تو آپ نے تکلّف کا موقع ہی نہیں دیا۔" خواجہ صاحب نے ایک بڑے سیب پر مشقِ ستم شروع کرتے ہوئے کہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں اس دوران میں بمشکل ہنسی ضبط کر سکا کیونکہ فضل سیبوں کے معاملے میں اپنا حافظہ تک کھو چکا تھا۔ وہ خواجہ صاحب کی پیش کردہ ہر قاش پر بڑا اپکا منہ بنا کر کہتا "آپ کی قسم اب بالکل گنجائش نہیں" لیکن باتوں ہی باتوں میں چپکے سے دوسری قاش بھی پکڑ لیتا اور جس وقت خواجہ صاحب نے اس سے پوچھا کہ آپ کو کچھ لٹریچر سے بھی شغف ہے یا نہیں تو اس کے ہاتھ میں تیسرے سیب کی آخری قاش تھی "کوئی خاص نہیں"۔ اس نے بڑے انہماک سے سیب کھاتے ہوئے جواب دیا "بچپن میں ارسطو، سقراط، اور افلاطوں کو بے شک پڑھا ہے اور وہ بھی اچھا کر کٹر بننے کے لئے"۔ اور یہ سن کر ہم دونوں ہکّا بکّا

رہ گئے۔ "یونانی حکماء کا بھلا کرکٹ سے کیا واسطہ"۔ خواجہ صاحب سے نہ رہا گیا اور انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ "بڑا واسطہ ہے خواجہ صاحب"۔ فضل سگریٹ سلگا کر بولا۔ "کرکٹ کا تعلق ہے کھلاڑی کی صحت سے اور صحت اچھی بنتی ہے طبی اور جنسی لٹریچر سے راہنمائی حاصل کرنے کے بعد"۔ اس نے وضاحت شروع کر دی۔ "چنانچہ ۱۹۴۴ میں جب میں ملیریا کا شکار ہو گیا تو ہمارے پڑوسی پروفیسر عبدالحمید نے مجھے ان تینوں حکما کی کتابیں مطالعہ کے لئے دیں جنہیں پڑھنے کے بعد میں نے سیدھا کشمیر کا رخ کر لیا۔ اور اُن تمام ہدایات پر سختی سے عمل پیرا ہوا۔ جو ان میں تحریر تھیں"۔ اس نے ایک لمبا کش لگایا اور کہنے لگا "آج کی سب کامیابیاں اسی کی بدولت ہیں"۔ "ذرا تفصیل سے بتائیے۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی کچھ استفادہ کر سکیں"۔ خواجہ صاحب بال کی کھال نکالنے پر آمادہ تھے۔ "میں نے انعام صاحب کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ۱۹۴۴ء میں مجھ پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا اور ڈاکٹروں نے مجھے کرکٹ کھیلنے سے منع کر دیا۔ ڈاکٹروں کا یہ مشورہ میرے لئے سخت

صدمے کا باعث تھا کیونکہ میں نے جس فن کی نذر اپنا سب کچھ کر دیا وہی مجھ سے چھینا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ میں ان کے کہنے پر کرکٹ چھوڑ دیتا کہ پروفیسر موصوف نے مجھے قدرتی طریقۂ علاج کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی صحت اور جنس پر لکھی ہوئی یونانی حکماء کی کتابیں اور امریکی ہیلتھ میگزین پڑھنے کے لئے دیئے۔ میں نے انہیں پڑھ کر گہرا تاثر لیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ بین الاقوامی شہرت کا مالک کرکٹر بننے کے لئے سب سے اوّل شے جسمانی قوت ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے موسم گرما کی تعطیلات آئیں تو میں اکیلا کشمیر چلا گیا اور وہاں پہنچتے ہی ایک عمدہ ہاؤس بوٹ کرایہ پر لے کر "ڈل لیک" میں عارضی رہائش گاہ بنائی اور ایک باقاعدہ پروگرام مرتب کر لیا۔ اس وقت میری روزانہ مصروفیات صرف ورزش اور کرکٹ تک محدود تھیں۔ میں صبح نماز سے فارغ ہوتے ہی نیکر اور فیلٹ پہن تھرماس شانے پر لٹکا ڈل لیک سے پانچ میل دور ایک پہاڑی پر واقع چشمہ شاہی کی چوٹی پر پہنچ جاتا اور خوب ورزش کرتا۔ اور چشمہ شاہی کے کیلسیم آمیز صحت بخش پانی

سے تھرماس بھر کر ڈل کے کنارے واپس گھر کو ہو لیتا۔ راستے میں سیبوں کے باغات کی سیر کرتا ہوا کسی باغ کے مالی سے چار آنے کے سیب خرید کر تمام راستہ کھاتا۔ گھر پہنچ کر میرا ناشتہ میری ہدایات کے بموجب تیار ہوتا یعنی ایک گلاس شہد ملا دودھ، چند ناشپاتیاں اور تھوڑے سے اخروٹ۔ ناشتہ کھا کر میں صرف ایک گھنٹہ آرام کرتا اور ۱۰۰۰ فٹ بلند تختِ سلیمان کی پہاڑی کا رُخ کر لیتا جو میرے گھر سے غالباً دو فرلانگ دُور تھی وہاں پہنچ کر میں ساری پہاڑی کا چکّر لگاتا اور آہستہ آہستہ میں نے خود کو اتنا عادی بنا لیا کہ میں صرف ½۱۲ منٹ میں اس پہاڑی کا چکّر لگا کر پسینے میں شرابور نیچے پہنچ کر دم لیتا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں کپڑوں سمیت کسی تالاب میں غوطہ لگا کر آیا ہوں۔ پہاڑی سے گھر واپسی پر میں نہاتا اور دوپہر ½۱۲ بجے تک آرام کرنے کے بعد کھانا کھاتا جو ایک گلاس دودھ، بافراط خشک و تازہ پھل اور کچی سبزیوں پر مشتمل ہوتا۔ کھانے کے بعد دو بجے تک پھر سستاتا اور اس دوران میں مختلف ہیلتھ میگزین اور کرکٹ کی

کتابوں کی ورق گردانی کرتا۔

مطالعے سے فارغ ہو کر میں تھوڑی دیر کے لئے صاف و شفاف اور دلکش جھیل ڈل کے نیلے نیلے پانی، سرسبز جھاڑیوں اور رنگا رنگ مچھلیوں کا نظارہ کرتا اور پانی کی سطح پر تیرتے کنول کے پھولوں کو تکتا رہتا جو ڈل کے حسن کو دوبالا کرنے میں پیش پیش تھے کچھ دیر بعد میں پیراکی والا لباس پہن کر سرد اور نیلی جھیل میں اتر جاتا اور اپنے گھر سے ڈیڑھ فرلانگ پرے تک تیرتا چلا جاتا جہاں ہاؤس بوٹ تھے اور لوگ ان تک شکارے کے ذریعے جاتے تھے۔ ہاؤس بوٹ کو ہاتھ لگا کر میں اسی طرح تیرتا واپس گھر چلا آتا اور اس طرح میں تقریباً تین فرلانگ روزانہ تیرتا۔ گھر پہنچتے ہی بادام ملی نمکین چائے تیار ملتی اور میں چائے پی کر ایک منٹ ضائع کئے بغیر سیدھا ایس۔ پی کالج سری نگر کو چل دیتا۔ وہاں دو تین گھنٹے متواتر کرکٹ کھیلنے کے بعد تھکا ہارا گھر کو لوٹتا اور شام کا کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتا۔ میں نے اسی پروگرام پر دو ماہ مسلسل عمل کیا اور جب لاہور پہنچا تو میں ناقابلِ رشک حد تک تندرست و توانا تھا

اور میرا رنگ بالکل اس سیب کی مانند سُرخ تھا۔" فضل نے پلیٹ
میں سے ایک سرخ سیب ہاتھ میں پکڑ کر خواجہ صاحب کو
دکھایا اور ہم بے ساختہ مسکرا دیئے۔" اسی دوران میں میں نے
ہائیکنگ اور ماؤنٹری کلب کے ایک مقابلے میں شرکت کر کے
اپنی قوّت کا امتحان کیا ــــ چنانچہ میں ۴۰ میل کی کراس کنٹری ہائیک
میں دوئم اور ۲۵ میل کی کراس کنٹری ہائیک میں اوّل آیا۔" پھر
تو آپ نے موجودہ مقام تک پہنچنے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اور
میں سوچنے لگا کہ اوول کے میدان میں فضل کی ایک ڈرامائی انداز
میں کامیابی محض حُسنِ اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ صلہ ہے انجام سے
بے نیاز ان منظّم کاوشوں کا جو وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب
تک پیہم کئے جا رہا ہے۔ اس نے سب سے پہلے اپنی صلاحیتوں
کا جائزہ لے کر اپنی منزل کا تعیّن کیا اور پھر ایک بھرپور تیقّن کے
ساتھ اس طرح آگے بڑھا کہ منزل پہ پہنچ کر ہی دم لیا۔" ہاں جی ہم
نے اُسے تیار ہو جانے کا الٹی میٹم دیا۔ اور وہ سگریٹ کو ایش ٹرے
میں مسل کر ٹھیک سے بیٹھ گیا۔ اور خواجہ صاحب شب بخیر کہہ کر

رخصت ہو گئے۔" ہاں جی" فضل نے کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا۔
"ساڑھے دس بج چکے ہیں انعام صاحب" فضل کی نگاہ رسٹ واچ پر تھی "میں اب گھنٹہ بھر سے زائد نہ بیٹھ سکوں گا۔ مجھے کل کے لئے تیاری بھی کرنی ہے"۔" آپ ایلف گوور سے تربیت حاصل کرنے کے بعد پاکستان چلے آئے تھے۔ اور ہٹن کو شکست دینے کے خواب دیکھتے ہوئے لاہور میں دن رات کرکٹ پریکٹس کر رہے تھے"۔
میں نے کمی وقت کی بات سنی اَن سنی کر کے خلاصہ بیان کر دیا اور پنسل پکڑ کر تیار ہو گیا۔ "ہوں" وہ حسبِ عادت صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور سگریٹ سلگا کر "شامِ غریباں" کے فریم پر نظریں جمائے خیالات کی رَو میں بہنے لگا: "اسی دوران میں پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ نے رانجی ٹرافی کی طرح بین الصوبائی جناح ٹورنامنٹ منعقد کیے جن میں مجھے پنجاب کی نمائندگی کا موقع ملا اور میری اوسط باؤلنگ اوّل رہی۔ ٹورنامنٹ کے اختتام پر کل پاکستان کرکٹ ٹیم کا انتخاب ہوا جس کے کپتان عبدالحفیظ کاردار منتخب ہوئے اور فروری کے آخر میں کرکٹ کنٹرول بورڈ نے تقریباً ۴۵ بہترین کھلاڑیوں کو ٹرائل

میچ کھیلنے کے لئے بہاول پور بھیجا تاکہ امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے کھلاڑیوں کو انگلستان روانہ کرنے والی ٹیم میں شامل کر کے اُن ناموں کا اعلان کیا جائے۔ چنانچہ میچ شروع ہوئے اور دیگر مشاق کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ محمد امین، محمد اسلم اور وزیر محمدؐ نے بھی قابل قدر کھیل کا مظاہرہ کیا۔ محمدؐ اسلم اور وزیر محمدؐ نے سینچریاں بنائیں اور محمدؐ امین نے آٹھ وکٹیں حاصل کیں۔ اس نتیجے کے پیشِ نظر ان تینوں کی پاکستان کرکٹ ٹیم میں شمولیت یقینی تھی لیکن افسوس کہ محمد امین کا نام نامعلوم وجوہ کی بنا پر متروک کر دیا گیا جس کا مجھے انتہائی قلق ہوا کیونکہ ایک مستحق کھلاڑی کو بلاوجہ اس کے حق سے محروم کرنا سراسر ناانصافی تھی۔

اس انتخابی کاروائی سے قبل کرکٹ بورڈ کے خداوندوں نے یقین دلایا تھا کہ بوقتِ انتخاب ان کھلاڑیوں کو ترجیح دی جائیگی جو فیلڈنگ میں غیر معمولی مہارت کے مالک ہوں مگر نہ جانے منور الحق اور ریاور سعید ایسے کھلاڑی کس بنا پر توجہ کے لائق نہ سمجھے گئے جو اچھے بیٹسمین اور باؤلر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلےٰ

درجہ کے فیلڈر بھی ہیں۔ حالانکہ ٹیم میں دو چار کھلاڑی ایسے بھی شامل کر لئے گئے جو نہ اس وقت کرکٹ کے ماہر تھے اور نہ آج ہیں۔

پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کے اس فیصلے کے خلاف جس قسم کا خاموش احتجاج یاور سعید نے کیا میں اس کے تصوّر سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ اس نے بورڈ کے اراکین کی "فہم سلیم" کو چیلنج کرنے کے لئے بذاتِ خود سمرسٹ کاؤنٹی کو اپنی خدمات پیش کیں اور وہ اسی طرف سے اپنے وطن پاکستان کے خلاف کھیلا اور اپنے ہی ملک کے چار ممتاز کھلاڑی ناکام بنا کر کرکٹ بورڈ کے ناخداؤں کو ایک عبرتناک سبق دیا۔" اور یہ کہہ کر فضل نے سگرٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ بہرحال پاکستان ٹیم کا آخری انتخاب عمل میں لایا گیا۔ اور قائد اور نائب قائد کی ذمہ داریاں بالترتیب کاردار کو اور مجھے سونپ دی گئیں۔ ہمارے علاوہ امتیاز احمد، مقصود احمد، محمد ابراہیم، زین العابدین غزالی، ذوالفقار احمد، محمود حسین، شجاع الدین، محمد حنیف، وزیر محمد، اکرام الٰہی، علیم الدین، شکور احمد، خالد وزیر، خالد حسن، اور محمد اسلم کو موقع دیا گیا۔ خان محمد چونکہ انگلستان کی طرف سے

لیگ پروفیشنل کرکٹ کھیلتے ہیں اس لئے انہیں اپنے کلب سے صرف ٹسٹ میچوں میں کھیلنے کی اجازت مل سکی۔ القصہ تمام رسمی مراحل طے ہونے کے بعد ہم لوگ بورڈ کی ہدایات کے مطابق ۲ مارچ کو مشترکہ مشق کے لئے بہاول پور کیمپ میں پہنچ گئے اور پریکٹس شروع کر دی۔

پروگرام کے مطابق ایک لیفٹیننٹ صاحب علی الصبح تشریف لے آتے اور جسمانی تربیّت کے لئے بہاول پور اسٹیڈیم کی گراؤنڈ میں دوڑ اور پی۔ ٹی۔ شروع کرا دیتے۔ گھنٹہ بھر کی ورزش کے بعد ہم کیمپوں میں جا کر ناشتہ کرتے اور نو بجے کے قریب فیلڈنگ پریکٹس کے لئے گراؤنڈ میں جمع ہو جاتے۔ ایک گھنٹہ فیلڈنگ کرنے کے بعد نٹ پریکٹس کی باری آجاتی اور کم و بیش ایک گھنٹہ اس کی نذر ہو جاتا۔ اس کے بعد ہم اسٹیڈیم میں اکٹھے ہو کر کرکٹ کے موضوع پر بحث مباحثہ شروع کر دیتے۔ اتنے میں لنچ کا وقت ہو جاتا اور ہم دوپہر کا کھانا کھا کر دو گھنٹے مکمّل آرام کرتے اور پھر نٹ پریکٹس شروع ہو جاتی۔ شام کو جب ہم کیمپوں کو لوٹتے تو جسم تکان سے

چُور ہوتا اور ہم کھانے سے فارغ ہو کر لمبی تان کر سو جاتے۔

ہمیں پریکٹس کرتے ابھی پندرہ ہی دن گذرے تھے کہ مجھے والدہ کے انتقال کی رُوح فرسا خبر ملی اور میں دل میں ایک غبار سائے اسی وقت لاہور چلا آیا۔ والدہ کی وفات کا صدمہ کچھ کم الم انگیز نہ تھا کہ میں جلدی سنبھل جاتا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماں کے خلوص اور ممتا کی شفقت سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ مقدّس ہستی مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی جس کی دعاؤں نے مجھے ہمیشہ کامرانی سے ہم کنار کیا۔ مجھے اس گھڑی یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں دنیا میں بے یار و مددگار اور تنہا رہ گیا ہوں۔ میری تمام قوتیں سلب ہو گئیں ہیں۔ وہ طاقت جو کھیل کے میدان میں بھی میری پشت پر ہوتی تھی مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ وہ قدم دنیا سے اُٹھ گئے ہیں جن کو چھو کر میں نے انگلستان روانہ ہونا تھا ——

ان دنوں میری کیفیت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی اور میں واپس بہاول پور نہ جا سکا۔ باقی کھلاڑی ایک مہینہ کی تربیتی مدت پوری کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور یہ طے پایا کہ ہم سب

دس اپریل کو کراچی پہنچ جائیں۔ میرے محکمہ نے اس مرتبہ بھی مجھے ڈیوٹی پر تصور کرتے ہوئے رخصت عنایت کر دی اور میں اپنی والدہ کی آخری آرام گاہ پر حاضر ہونے کے بعد ٹیم کے مینیجر سیّد فدا حسن، نائب مینیجر مسعود صلاح الدین، امتیاز اور اسلم کے ہمراہ لاہور اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر سینکڑوں لوگ ہمیں الوداع کہنے کے لئے آئے اور سب نے مجھے کہا کہ پاکستان کی لاج اب تمہارے ہاتھ ہے۔ اسے ہر قیمت پر بچانا تمہارا فرض ہے —— میری قلبی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور میں امید و بیم میں مبتلا سینکڑوں بہی خواہوں کو بمشکل الوداع کہہ کر لاہور سے چل دیا اور دس اپریل کو ہوٹل میٹروپول کراچی پہنچ گیا۔ شام کو کراچی کرکٹ ایسوسی ایشن نے ایک عشائیہ ترتیب دیا۔ اس دعوت میں کئی اشخاص نے تقاریر کیں اور مختلف لوگوں کے پیغامات پڑھ کر سنائے۔ ان خطوط میں وجے مرچنٹ کا پیغام بھی تھا۔ جنہوں نے لکھا کہ اگر پاکستان کرکٹ ٹیم دس کاؤنٹی میچ "برابر" کھیلے اور چار یا پانچ میچ جیت لے تو جب بھی انگلستان کا دورہ کامیاب

سمجھنا چاہیئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مرچنٹ نے ٹسٹ میچوں کی ہار جیت کا ذکر تک نہ کیا پیغام کے اختتام پر جی تو چاہا کہ ابھی مائیکروفون پر جا کر کہہ دوں کہ مرچنٹ کو ہمارے کھیل کا اندازہ ٹیم کے انگلستان پہنچنے کے بعد کرنا چاہیئے تھا لیکن جذبات پر قابو پا کر خاموش ہو رہا۔ اس کے بعد حفیظ کاردار تقریر کے لئے اٹھے اور انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ انگلستان کی ٹیم ہم سے بہت زیادہ مضبوط ہے لیکن پھر بھی ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ اچھے سے اچھے کھیل کی نمائش کریں۔ دعوت کے بعد اکثر لوگوں نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی اور میں نے ہر ایک کو پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ ہم کاؤنٹیوں کے ساتھ بلا خوف و خطر کھیلیں گے۔ اور ٹسٹ میچ بھی آسانی سے نہیں جیتنے دیں گے اور بعض اوقات میں بالکل رجائی بن کر کہہ دیتا" ایک ٹسٹ میچ تو یقیناً میرا ہے"۔ اس وقت میں واحد شخص تھا جو اس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نظر آتا تھا ورنہ ماہرینِ فن کی طرح عوام کی بھی وہی رائے تھی جو وجے مرچنٹ کی۔

گیارہ اپریل کا دن بھی کچھ اسی قسم کے ہنگاموں میں گزر گیا اور بارہ اپریل کو ہمیں بڑی شان وشوکت سے ساحل کراچی پر الوداع کہا گیا اور ہماری ٹیم "بٹوری" جہاز میں بیٹھ کر مستقبل کے تانے بانے بننے لگی۔ کچھ دیر بعد جہاز نے لنگر اٹھائے اور رسائرن کے ذریعے عزمِ سفر کا اعلان کر کے ایشیا کے ہالی وُڈ بمبئی کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم ڈیک پر کھڑے ساحل کراچی پر آخری نگاہ ڈال رہے تھے اور اپنے احباب کو ہاتھ لہرا لہرا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ ہماری نگاہیں اس وقت تک ساحل کے تعاقب میں رہیں جب تک کراچی اُفق میں نہ ڈوب گیا اور دوستوں کے چہرے دھندلا کر نیلگوں سمندر کی لہروں میں مدغم نہ ہو گئے۔ جب جہاز کنارے سے کافی دور نکل گیا تو ہم رنج وخوشی کے ملے جذبات سے معمور سامان چیک کرنے کے لئے اپنے اپنے کیبن میں چلے گئے۔ جہاز جوں جوں فاصلہ طے کرتا جاتا تھا۔ میری افسردگی اور اضمحلال میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے بار بار اپنے احباب اور عزیز و اقارب یاد آ رہے تھے جنہیں میں ایک طویل عرصہ کے لئے چھوڑ کے جا رہا تھا۔ مجھے اسی وقت ننھا شاہد محمود یاد آ گیا اور اس

کا مسکراتا معصوم چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا اور اس کی تصویر نکال کر بہت دیر تک دیکھتا رہا اور سوچنے لگا کہ پرائے ملک میں خواہ کتنے ہی دلبستگی کے سامان ہوں پردیسی آخر پردیس ہے۔ میں اپنے سینے میں ایک کسک اور خلش محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی شے ان تمام احساسات پر غالب آئی تو صرف یہ کہ میں وطن کو ناموسِ وطن کی حفاظت کے لئے چھوڑ رہا ہوں جس کو پانے کی خاطر میں نے عمر کا بیشتر حصّہ جدّوجہد میں صرف کیا ہے۔ میں انہی خیالات میں مستغرق منزلیں طے کئے جا رہا تھا کہ شام کے کھانے کی گھنٹی ہوئی اور ہم سب ایک وسیع اور خوبصورت ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے جہاں ہر شے بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ ہر میز پہ مینو پڑے ہوئے تھے جن پر طرح طرح کی ڈیشز کے نام لکھے ہوئے تھے اور ہم جس کھانے کی فرمائش کرتے ہمیں مہیّا کر دیا جاتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دئیے اور میں نے بھی جہاز کے بالائی ڈیک پر واقع اپنے کیبن کا رُخ کر لیا جہاں میرے ساتھ کاردار اور اسسٹنٹ مینجر

صلاح الدین مقیم تھے۔ اس رات ہم لوگ جلد ہی سو گئے کیونکہ ایک تو ہر ایک کے دل میں بے چینی تھی اور دوسرے جہاز پر کوئی خاص تفریحی پروگرام بھی نہیں تھا کہ ہم دل بہلاوے کیلئے جاگتے۔

صبح اُٹھے تو پروگرام بنایا کہ ٹیم روزانہ صبح چھ بجے اٹھ کر فزیکل ٹریننگ کے بعد فیلڈنگ پریکٹس کیا کرے چنانچہ اس پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ تیسرے دن ہمارا جہاز بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور وہاں سے تقریباً ایک ہزار مسافر لندن جانے کے لئے سوار ہوئے۔ یکایک اتنے نفوس کی آمد سے جہاز میں خاصی گہما گہمی ہو گئی اور وقت کٹی کے مشاغل میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا گویا جہاز ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو پانی کی سطح پر تیرتا چلا جا رہا ہے۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے لیکن ایک محدود سی جگہ میں چاہے کتنے ہی انسان ہوں زُود یا بدیر ایک دوسرے کو جاننے لگ جاتے ہیں۔ یہی حال ہمارا ہوا اور تمام لوگ پاکستان کرکٹ ٹیم سے بہت جلد شناسا ہو گئے۔ ہم بھی خوش تھے کہ چلو دن بھر بور ہونے سے نجات ملی۔ بمبئی سے روانہ



پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی جنہوں نے انگلستان کا دورہ کیا۔ ٹیم کے منیجر سید فدا حسن شاہ صاحب
سُوٹ میں ملبُوس درمیان میں تشریف فرما ہیں۔

ہونے کے بعد کوئی ایک آدھ دن تک فیلڈنگ پریکٹس جاری
رہ سکی کیونکہ ہمارے پاس صرف سات عدد گیندیں تھیں جو بیٹسمین
کی عنایت سے سمندر کی نذر ہو گئیں۔ لہٰذا ہم پی۔ ٹی سے فارغ
ہو کر ناشتہ وغیرہ کرتے اور مختلف اِن ڈور کھیلوں میں منہمک
ہو جاتے۔ ہم سب نے شطرنج، برج اور ٹیبل ٹینس کے مقابلوں میں
حصّہ لیا اور جیت ہمیشہ ہماری ٹیم کے کسی نہ کسی ممبر کی ہوئی۔ اسی
اثنا میں ایک "فینسی ڈریس" کا مقابلہ ہوا جس میں اوّل انعام مجھے ملا۔
ہم اسی طرح ہنستے کھیلتے سفر طے کرتے رہے حتیٰ کہ دو مئی کا دن
آیا۔ اور ہمارا جہاز "ساؤتھ ہیمپٹن" کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گیا۔ اسی
وقت ہمارے منیجر سید فدا حسن تشریف لائے اور ہمیں جہاز کے
بالائی ڈیک کی بار میں جانے کی ہدایت کی۔ ہم اوپر پہنچے تو سرد ہوا کے
کے جھکڑ چل رہے تھے اور بلا کی سردی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایم۔ سی۔
سی کے خزانچی لارڈ ایلتھم، بی۔ بی۔ سی ٹیلیویژن اور پریس کے نمائندے
مع فوٹوگرافرز اور کرکٹ کے کئی شائقین ہمارے خیر مقدم کے لئے
بار میں آپہنچے۔ ان سب کے علاوہ پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے

ہائی کمشنر صاحب کے دوئم سیکرٹری جناب آفتاب احمد خاں بھی تشریف لائے تھے۔ تمام لوگ ہم سے فرداً فرداً مل چکے تو اخباری نمائندوں نے ہمارے انٹرویو لینے شروع کر دیئے جس کی تشہیر بذریعہ ٹیلیویژن کی گئی۔ مجھ سے جس کسی نے انٹرویو کیا اس نے دو سوالات خصوصیت سے پوچھے۔ اوّل یہ کہ مجھے انگلستان کے مشہور باؤلر "ایلک بیڈسر" سے کیوں تشبیہہ دی ہے اور دوئم یہ کہ آیا مجھے انگلستان کا موسم اور وکٹ راس آئے گی یا نہیں کیونکہ انگلینڈ کی وکٹ پاکستان کی وکٹ سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے دونوں سوالوں کا ہر ایک کو بالترتیب یہی جواب دیا کہ "ایلک بیڈسر" سے میری مشابہت کا سبب میری باؤلنگ کی رفتار اور باؤلنگ کے داؤ پیچ ہیں جو اُس سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں باقی رہا موسم تو میں چونکہ پنجاب کا باشندہ ہوں جہاں جاڑوں میں بے پناہ سردی ہوتی ہے۔ لہٰذا انگلستان کی آب و ہوا نہ تو میرے لئے اجنبی ہے اور نہ ہی میرے کھیل میں خلل انداز ہو سکتی ہے۔

ملاقاتوں کی کھینچا تانی کوئی ڈھائی گھنٹے جاری رہی اور اِس

دوران میں بارش بھی شروع ہوگئی اور ہم غالباً تین بجے راؤتھیامپٹن سے بذریعہ گاڑی لندن روانہ ہوگئے۔ اور شام چھ بجے کے قریب لندن کے ایک اسٹیشن واٹرلو پر جا اترے جہاں انگلستانی ٹیم کے کپتان لین ہٹن۔ پاکستان انگلٹس کے استاد الیف۔ گوور، پریس کے فوٹوگرافرز اور سینکڑوں تماشائی ہمارے استقبال کو جمع تھے میں الیف گوور کو بڑی عقیدت اور گرمجوشی سے ملا اور وہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ وہیں لین ہٹن سے بھی تعارف ہوا اور اس کی سردمہری سے میں نے محسوس کیا کہ وہ کافی مغرور انسان ہے۔"

"وہ کیوں" میں نے بڑی مدت کے بعد ایک جملہ کہہ ہی دیا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"۔ فضل نے لیٹے لیٹے جواب دیا وہ اس دوران میں صوفے پر باضابطہ لیٹ چکا تھا۔ "بقول شخصے اس نے سوچا ہوگا کہ یہ ڈیم فول چھوکرے کہاں سے آگئے ہیں"۔

"خوب" میں نے سر ہلایا۔ اور وہ پھر شروع ہوگیا۔ واٹرلو کے اسٹیشن پر قریباً آدھ گھنٹہ رکنے کے بعد ہم بارش کا نظارہ کرتے "برنز ہوٹل" میں جا پہنچے جو مرکزی لندن میں واقع ہے۔ ہوٹل میں بھی پریس کے

کافی نمائندے پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے جاتے ہی ہمیں پکڑ لیا اور انٹرویو لیتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور دوسرے دن اخبارات میں کرکٹ ٹیم کے متعلق بہتیرا کچھ لکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ انگلستان کے عوام کو ہمارے بارے میں کوئی خاص علم نہیں میرا اندازہ تقریباً ٹھیک نکلا کیونکہ ایم۔ سی۔ سی کو ہمارے تعارف لکھنے کے لئے ایلف۔ گوور کی خدمات حاصل کرنی پڑیں جو ہم سب سے بخوبی آشنا تھے۔ چنانچہ ایلف۔ گوور نے "آفیشل سوونیر بک" مرتب کرنے میں کافی مدد دی جس میں ہمارے حالات شائع کئے گئے۔"

"انعام صاحب،" فضل نے ایک جمپ لگایا اور یکدم سیدھا کھڑا ہو کر سینے کو مفلر سے ڈھانپنے لگا۔ "اگر میں ہی بولتا چلا جاؤں تو کبھی تو آپ بھی کہہ دیا کیجئے بس کرو۔" اس نے دین کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر سگرٹ نکالا اور سلگا کر دروازے کا رُخ کر لیا "مجھے کاغذات تو سنبھال لینے دیجئے۔" میں نے اس یک لخت عجلت پر احتجاج کیا "بندہ تو چلا۔" اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لئے اور

تاریک گلی میں جاکر ٹہلنا شروع کر دیا۔ میں نے فائل سنبھال کر کمرے کی بتی بجھائی اور مکتبے سے باہر نکل آیا۔

۱۲ تاریخ کی شام کو میں اسے رخصت کرنے کے لئے سوا آٹھ بجے اسٹیشن پر پہنچا۔ فضل کے علاوہ باقی سب موجود تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ کے کمرہ کے سامنے کھڑے تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں بھارتی ٹیم کے دورہ پاکستان کے متعلق شکور کے خیالات معلوم کرنا چاہے لیکن اس نے میرے اصرار کے باوجود صرف "جو خدا کو منظور" کہنے پر اکتفا کی اور بالآخر میں خاموش ہو گیا۔ میں نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور فضل کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملتا تھا ناچار ہم پھر محو کلام ہو گئے۔ "گڈ ایوننگ جنٹلمین" یہ فضل کی آواز تھی۔ وہ خاکی رین کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پاؤں پھیلا کر سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کے آتے ہی مصنوعی سنجیدہ فضا پے در پے قہقہوں کے بار تلے دب گئی اور ہم کچھ دیر کے لئے اپنے آپ سے

بے خبر ہو گئے۔ ٹن ٹن ٹن ٹن .... اسٹیشن کا گھنٹہ گاڑی چھوٹنے
کی اطلاع دے رہا تھا .... انجن نے آخری وسل دیا اور
گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آ گئی۔ فضل نے ہر ایک
سے مصافحہ کیا اور لپک کر کمپارٹمنٹ میں پہنچ گیا ...... رات
کے ٹھیک پونے نو بجے پاکستان میل رینگتی ہوئی چار نمبر پلیٹ فارم
چھوڑ رہی تھی اور فضل ڈبے کے دروازے پر کھڑا اپنا دایاں ہاتھ
لہرا لہرا کر ہمیں الوداع کہہ رہا تھا ...... اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ
کی طرح اب بھی دلکش مسکراہٹ رقصاں تھی اور چہرے پر
ناقابلِ شکست اعتماد کے آثار نمایاں تھے۔ وہ حسبِ معمول ایک
غیر متزلزل یقین کے ساتھ اپنی نئی امتحان گاہ کی جانب رواں
تھا۔ اس کے بشاش چہرے پر تفکر کی ادنیٰ سی جھلک بھی موجود
نہ تھی شاید اسی لئے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ امتحانات کی زد میں رہا ہے
...... ہم سب کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں جو لحظہ بہ لحظہ دھندلاتا
جا رہا تھا اور چند ثانیے بعد اس کے خدوخال یارڈ کے اندھیرے میں گم
ہو گئے ...... پاکستان میل کا برق رفتار انجن اسے ہم سے دور لئے

جا رہا تھا...... کافی دور...... پٹھانوں کے دیس پشاور میں

جہاں اسے سرحد کی کرکٹ ٹیم سے میچ کھیلنا تھا...... اور

یہاں تک پہنچ کر میرا قلم رک گیا...... میرے ذہن میں اٹھارہ کی

بے کیف شام کے نقوش اُبھرنے لگے...... اور پھر میری آنکھوں

کے سامنے پلازا سینما کی خوش نما بلڈنگ گھومنے لگی جہاں میں نے

اگلے روز موسیقی اور مزاح سے بھرپور فلم "لیٹن لورز" دیکھی تھی تاکہ اگلے

روز خوش باش مُوڈ میں اس شخصیت کا خاکہ مرتب کروں جس

نے ہر حال میں مسکرانا ہی سیکھا ہے...... میں نے قلم میز پر رکھ

دیا اور ۲۰ نومبر کی سرد اور خنک صبح کو خوش آمدید کہنے کے لئے

کمرے سے نکل کر صحن میں چلا آیا...... آسمان پر اب بھی کہیں

کہیں کوئی ستارہ ٹمٹما رہا تھا۔

دو دن یونہی بے کیفی میں گزرے۔ ۲۲ کو اس کی واپسی تھی

میں نے ٹھیک پانچ بجے ملاقات کا قصد کیا لیکن ۱۹ تاریخ کی مسلسل

شب بیداری اور متواتر لکھنے سے طبیعت مضمحل سی تھی لہٰذا ارادہ

ملتوی کر دیا اور پھر کچھ ایسی افتاد آن پڑی کہ دوسرے روز بھی نہ جا سکا۔ ۲۴ تاریخ کی شام کو میں ٹھیک پانچ بجے اس کی قیام گاہ پہ پہنچ گیا مگر چار گھنٹے کے حوصلہ شکن انتظار کے باوجود حضرت تشریف نہ لائے۔

میں انتظار کی ناقابل برداشت اذیت سے دل برداشتہ ہو کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور مصمم ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ آج علیک سلیک سے پہلے ہی دست و گریباں ہو جاؤنگا کہ حضور دس بجے کے قریب آ نازل ہوئے اور پائیدان پہ بوٹ رگڑتے ہوئے دروازے پر کھڑے گوہر افشانی کرنے لگے "ہاہا...... ہہا..... عزرائیل بخیر و عافیت موجود ہیں۔ اور کوشش کے باوجود مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ فضل کی آمد کے ساتھ ہی ماحول کی افسردگی یکا یک کافور ہو گئی اور فضا میں پھر وہی مسکراہٹیں اور جانے پہچانے قہقہے بکھرنے لگے۔ وہ کافی دیر پشاور کے حالات سناتا رہا۔ دوران گفتگو میں نے پوچھا "کوئی خاص واقعہ بھی پیش آیا؟" کیوں نہیں" فضل جرابیں اتارتے ہوئے بولا اور



انٹرنیشنل فوڈ فیئر (بین الاقوامی طعامی میلہ) منعقدہ لندن میں پاکستانی اسٹال پر
فضل محمود پکوڑے تلنے کے بعد وزیر محمد کو کھلا رہے ہیں۔

ملازم کو آواز دے کر اخبار "شہباز" لانے کو کہا۔ "بعض پٹھان بڑے بڑے مزے کے آدمی ہوتے ہیں۔" اس نے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے کہا اور نائٹ گاؤن کی پیٹی میں گرہ لگاتے ہوئے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "سگریٹ پلیز" اس نے پیکٹ بڑھایا۔ "شکریہ" اور فضا میں سیاہ و سپید دھوئیں کی آڑی ترچھی لکیریں پھیلنے لگیں۔ "لیجئے ذرا غور سے سنیئے" اس نے ملازم کے ہاتھ سے اخبار پکڑ کر اندرونی صفحہ نکالا اور کہنے لگا: دنیا کو یہ تو معلوم ہے کہ فضل محمود ایک اچھا باؤلر ہے لیکن اس کا اصل سبب کیا ہے، یہ صرف "شہباز" کا نمائندہ ہی جانتا ہے۔ میکا ہے جس نے ڈان کیفے پشاور میں مجھ سے انٹرویو کیا۔ اسے اب ذرا توجہ سے سنئے اور سننے کے بعد اول تو سر دھنئے ورنہ پھر پیٹیئے ضرور۔" فضل کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے ایک لمبا کش لگایا اور پڑھنا شروع کر دیا "لکھتے ہیں! اوول کے خوبصورت پاکستانی ہیرو فضل محمود کو دنیائے کرکٹ میں وہ مقام حاصل ہے جو دنیا کے سب سے بڑے برطانوی میڈیم فاسٹ باؤلر ایلک بیڈسر نے سالہا سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد

حاصل کیا تھا۔ اب پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کا یہ مایہ ناز باؤلر نہ صرف ایلک بیڈسر کو پیچھے چھوڑ جائے گا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے کامیاب میڈیم فاسٹ باؤلر ہو گا۔

اس کی بڑی معقول وجوہات ہیں۔" انعام صاحب" فضل نے پڑھتے پڑھتے مجھے متوجہ کیا۔

"لیجئے اب تیار ہو جایئے وہ معقول وجوہات سننے کے لئے فرماتے ہیں:۔

"وہ نوجوان ہے"۔

"خوبصورت ہے"۔

"تنومند ہے۔"

اور فضل نے اخبار پھینک کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"سمجھے آپ! اس پٹھان کی نظر میں یہ ہیں میری فنی عظمت کی معقول وجوہات" اور ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

"ہاں جی" اس نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا اور میں

نے فائل میں سے پیڈ نکال کر ورق اُلٹنے شروع کر دیئے: "آپ لوگ کراچی سے ساؤتھ ایمپٹن اور وہاں سے واٹر لو کے اسٹیشن پر ایلیف گوور اور ہٹن کو مِل ملا کر "برنرز ہوٹل" (مرکزی لندن) میں قیام پذیر تھے۔ جہاں پریس کے نمائندوں کی ملاقات اور آرٹیکلز کے بعد آپ کے مفصل تعارف لکھنے کے لئے ایلف گوور کی خدمات حاصل کی گئیں اور انہوں نے "آفیشل سوونیر بک" ترتیب دینے میں کافی مدد دی۔" میں نے پوری یاد دہانی کے لئے لمبی چوڑی روداد بیان کر دی کیونکہ گذشتہ نشست کو تقریباً سات دن گذر چکے تھے۔

"ہوں" فضل نے سر کے نیچے ہاتھوں کی قینچی سی بنالی اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے داستان شروع کر دی: "دو مئی سے سات مئی تک ہم لندن ہی میں مقیم رہے اس دوران میں ہم نے ہزار کوشش کی کہ کرکٹ پریکٹس شروع کر دیں لیکن ہر روز کی بارش نے ہمیں ایک دن بھی مشق کرنے کی مہلت نہ دی۔ تمام دن یوں ضائع ہو جاتا اور شام کو ہمیں لندن کی مشہور کلبوں کے دعوت ناموں کی

تعمیل کرنی پڑتی مختصراً یہ کہ کراچی سے لے کر وُسٹر کاؤنٹی سے میچ کے آغاز تک ہم مشق سے بالکل محروم رہے۔

سات مئی کو ہم لندن سے ڈیڑھ پونے دو سو میل دور وُسٹر کے مقام پر پہنچے اور اسی دن اگلے روز کھیلنے والی ٹیم کا انتخاب عمل میں لایا گیا جس میں میرے علاوہ حنیف، علیم، وقار، امتیاز، مقصود، کاردار، غزالی، اکرام اور محمود حسین شامل تھے۔

۸ مئی کو ہم کاؤنٹی گراؤنڈ میں پہنچے جہاں تقریباً چار ہزار تماشائی کھیل دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ وُسٹر کی طرف سے کپتان رچرڈسن، ڈیوز، برڈ، براڈبینٹ، ڈیوریکس، ایش مین، گرووز، پرکس، یارنلڈ اور فلیوف نمائندگی کر رہے تھے۔

۱۱½ بجے ٹاس کی رسم ادا کی گئی اور عبدالحفیظ کاردار کو پہل کرنے کا موقع مل گیا۔ کاردار نے پاکستان کرکٹ ٹیم کی "اوّل بیٹنگ" شروع کرائی اور سب سے پہلے حنیف، اور علیم کو میدان میں بھیجا جن کے مقابلے کو پرکس اور گروو باؤلنگ کے لئے آئے۔ میچ کی ابتدا خاصی حوصلہ افزا رہی اور پاکستان ٹیم نے ایک بھی کھلاڑی کھوئے بغیر

اسکور بورڈ پر ۵۰ رنز کی پلیٹ لگوا دی۔ کھیل آہستہ آہستہ جاری تھا کہ حنیف صرف ۲۹ رنز بنا کر میدان سے واپس چلے آئے جس وقت پاکستان کی پہلی وکٹ گری اس وقت ہمارا اسکور ۵۴ تھا۔ حنیف کے بعد وقار کو بھیجا گیا لیکن اسے دو سے زائد رنز بنانی نصیب نہ ہوئیں اور بے چارے کو بہت جلد گراؤنڈ سے رخصت ہونا پڑا۔ وقار کی جگہ مقصود نے سنبھالی اور کھیل میں کچھ جان سی پڑ گئی۔ چنانچہ مقصود اور علیم کے اشتراک نے حنیف اور وقار کی ناکامی کا صدمہ کم سے کم تر کر دیا...... علیم الدین نے ۴۲ رنز بنائیں اور مقصود احمد نے ۱۱ اور جس وقت ہمارا کل اسکور ۹۴ تک پہنچا ویسٹرن والوں نے ہماری ایک وکٹ اور اڑا دی اور مقصود بھی میدان چھوڑ کر چلا آیا۔ مقصود کے بعد کاردار کھیلنے کے لئے گئے لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ فقط ۱۳ رنز بنا کر پویلین کی طرف لوٹ گئے۔ اس میچ میں تیسرے درجے پر میرا اسکور رہا۔ میں نے ۶۰ رنز بنائیں اور دوسرے دن یعنی ۹ تاریخ کو لنچ کے وقفہ سے تھوڑی دیر پہلے جا کر آؤٹ ہوا۔ اس

میچ میں ہماری ٹیم نے کل ۲۸۰ رنز بنائیں اور آؤٹ ہوگئی۔

پاکستان کی پہلی اننگز میں علیم اور مقصود نے جس شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ وُسٹر گراؤنڈ اسے کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ ان دونوں کے علاوہ ٹیم کے بقیہ ارکان نے بھی قابلِ فخر کھیل کی نمائش کی۔

ہمارے بعد وسٹر ٹیم نے اپنی اوّل اننگز کا آغاز کیا تو پاکستان کی طرف سے میں اور محمود حسین باؤلنگ کے لئے نکلے۔ میں نے چند گیندیں پھینک کر محسوس کیا کہ بکثرت بیٹنگ کرنے سے شدید قسم کی گیند اندازی قدرے مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال میں نے پوری قوت سے باؤلنگ شروع کی اور اننگز کے اختتام تک یارنلڈ، گرود، ایشمین اور وُسٹر کے کپتان بروڈ کو میدان سے رخصت کر دیا۔ کاردار نے ڈیوز، پرکس اور فلیول کی آرزوئے کامیابی شرمندۂ تکمیل نہ ہونے دی۔ رچرڈسن اور ڈیوریوکس۔ خالد حسن کے ہتے چڑھ گئے اور اکرام الٰہی کی کوششوں نے کینن کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے اس دوران میں ۲۶ اوور پھینکے جن میں سے آٹھ میڈن رہے اور باؤلنگ آنرز کے حقدار میں اور کاردار ٹھہرے

وُسٹر ٹیم میں سے اس دن "چپ، وست" کھلاڑی رچرڈ سن ہی اچھّی طرح کھیل سکا اور ۱۰ رنز بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ شام ۶½ بجے کے قریب وسٹر ٹیم نے ۲۱۰ رنز کے عوض گراؤنڈ کو الوداع کہتے ہوئے اگلے روز تک کھیل کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور ہزاروں تماشائی مختلف پیشگوئیاں کرتے ہوئے گھروں کو لوٹ گئے۔

تیسرے دن یعنی گیارہ تاریخ کو ہم گراؤنڈ میں پہنچے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ موسم گذشتہ دو روز کی طرح بالکل خوشگوار تھا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا ورنہ یہ بات مشہور ہے کہ وُسٹر میچ اور بارش کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

وُسٹر والوں نے کھیل کا آغاز کیا اور رچرڈسن اور کینین نے بہت محتاط ہو کر کھیلنا شروع کیا کیونکہ انہیں اپنا اسکور ہماری پہلی اننگز کے اسکور کے برابر لانے کے لئے ۲۱۰ رنز درکار تھیں۔ ان دونوں کھلاڑیوں کی احتیاط واقعی کارآمد ثابت ہوئی اور رچرڈسن نے مجھ سے اس وقت شکست کھائی جب وُسٹر کا کل اسکور ۶۹ تک پہنچ چکا تھا

رچرڈسن کی جگہ ڈیوز نے سنبھالی اور کپتین کے اشتراک میں جم کر کھیلنے لگا۔ ان دونوں کی مساعی نے لنچ کا وقفہ شروع ہونے تک اسکور بورڈ پر ۱۵۶ کی پلیٹ آویزاں کرادی۔ اس وقت تماشائیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ اب میچ برابر ہو جائے گا کیونکہ ان دونوں کے تیور یہی بتلاتے تھے کہ وہ شام تک کریز چھوڑنے کا نام نہ لیں گے مزید برآں ابھی وسٹر کی پوری ٹیم کھیلنے کے لئے باقی تھی۔

لنچ کے لئے دونوں ٹیمیں میدان سے نکلیں۔ جب میں اپنے ڈریسنگ روم میں پہنچا تو شجاع نے مسکرا کر کہا کہ اب تو میچ بلا شبہ برابر ہے اور وسٹر شائر کو شکست دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مجھے یہ بات سخت ناگوار گذری کیونکہ میدان میں کھیلنے والے کھلاڑی کو حوصلہ شکن رائے دینی کسی صورت بھی عقلمندی نہیں۔ لیکن میں پی گیا اور صرف اتنا کہا کہ جب تک باؤلر کے ہاتھ سے آخری گیند نہ نکل جائے میچ کی ہار جیت کا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے اور یقین مانو کہ لنچ کے بعد میں جیت کر آؤں گا۔ اس وقت ٹیم کے دو تین کھلاڑی اور بھی پاس کھڑے تھے۔ میری بات سن کر وہ بھی مسکرا دیئے

کیونکہ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے قلیل عرصے میں بھی میچ جیتا ہارا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہر ایک کو میچ کے برابر ہونے کا اس قدر پختہ یقین تھا کہ وُسٹر کے کپتان برڈ نے بھی کھانے کی میز پر بعینہٖ یہی خیال کا اظہار کیا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ اب میچ برابر ہی سمجھئے کیونکہ کھیل کے اختتام میں بہت تھوڑا وقت باقی ہے اور وُسٹر کے بیٹسمین اس دوران میں خاطر خواہ رنز بنا لیں گے۔

لنچ کے بعد میں پھر ڈریسنگ رُوم میں پہنچا اور شجاع کو یہ کہہ کر کہ ایک اوور میں ۶ بیٹسمین بھی ناکام بنائے جا سکتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ گراؤنڈ میں چلا گیا اور کینن کو پہلا اوور پھینکنا شروع کیا۔ کینن نے میری پہلی گیند تو روک لی مگر دوسری گیند کو زور سے کٹ کیا اور کاردار نے یہ تیز کیچ بآسانی پکڑ لیا۔ کینن کے خلا کو پُر کرنے کے لئے برڈ آئے تو میں نے اپنی مخصوص گینڈ لیگ کٹر کچھ زیادہ ہی زور سے لیگ اور مڈل سٹمپ کے درمیان پھینکی۔ برڈ نے ہر چند کوشش کی لیکن وہ گیند کو بیٹ سے نہ روک سکا اور چونکہ اس نے وکٹیں اپنے پیڈز کی آڑ میں روکی ہوئی تھیں

لہٰذا گیند اس کے پیڈز پہ لگی اور وسٹر کا کپتان ایل۔بی۔ڈبلیو کا شکار ہو گیا۔ برڈ کے بعد براڈبینٹ آیا۔ مجھے اس وقت "ہیٹ ٹرک" کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے کاردار کو کہہ کے اپنے تمام فیلڈر براڈبینٹ کے گرد جمع کر لئے اور اوور کی چوتھی گیند مڈل سٹمپ پر پھینکی مگر افسوس کہ گیند نہ تو وکٹ سے گلے مل سکی اور نہ ہی بیٹ کی ہٹ کا نشانہ بن سکی اور میرا "ہیٹ ٹرک" کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ بہرکیف میں نے پانچویں گیند پھینکی اور برڈ کی طرح براڈبینٹ کے پیڈز بھی گیند کی دست برد سے نہ بچ سکے۔ ہم سب نے چلا کر اپیل کی اور جب میں نے گھوم کر امپائر کی طرف دیکھا تو وہ بیٹسمین کو ایل۔بی۔ڈبلیو کی بنا پر آؤٹ دے چکا تھا — وسٹر کے کھلاڑیوں کی پے در پے شکست سے میچ کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ کہاں وہ وقت کہ مخالف ٹیم کا صرف ایک کھلاڑی آؤٹ اور اسکور کا ہندسہ ۵۶ اور کہاں اب یہ حالت کہ وہ ایک بھی رن کا اضافہ کئے بغیر تین اور کھلاڑیوں سے محروم ہو گئے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ٹیم کے ارکان اور تماشائیوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اور سبھی لوگ



انگلستان کے دورہ کا پہلا میچ جو ووسٹر شائر کے خلاف کھیلا گیا۔ ووسٹر شائر کی دوسری اننگ میں فضل محمود کی گیند مسٹر براڈ بینڈ کے پیڈ پر لگی۔ تمام کھلاڑی اپیل کر رہے ہیں۔ امپائر نے بیٹسمین کو آؤٹ قرار دے دیا۔

یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ واقعی کھیل کا نقشہ چند لمحات میں بدل سکتا ہے۔ موجودہ نتیجے کو دیکھ کر ہماری ٹیم کو بھی جیت کی امید ہونے لگی۔ براڈبینٹ کے بعد میں نے اسی شدت سے باؤلنگ جاری رکھی اور رفتہ رفتہ یارنلڈ، گرووز، پرکس اور ایشمین کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس اثنا میں کاردار نے رچرڈسن اور ڈیوز کو پسپا کیا اور خالد حسن نے ڈیورییکس کو۔ چنانچہ شام سے پہلے تقریباً چار بجے تک ورسٹرشائر کی کل ٹیم ۲۲۴ رنز کے عوض میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ پاکستان کو میچ جیتنے کے لئے فقط ۳۴ رنز کی ضرورت تھی جو دوسری اننگز میں حنیف اور وقار کو کھو کر پوری ہو گئی اور پاکستان ٹیم ۸ وکٹوں سے جیت گئی۔ جس وقت میں وسٹر ٹیم کو آؤٹ کر کے پویلین میں پہنچا تو وہ کھلاڑی جو اس میچ میں شریک نہیں تھے کہنے لگے کہ واقعی فضل صاحب آخری گیند پھینکنے سے قبل ہار جیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کرکٹ کے لحاظ سے ورسٹرشائر انگلستان کی مضبوط ترین کاؤنٹی تصور کی جاتی ہے۔ لہٰذا اُن کی شکست کے بعد پاکستان کرکٹ ٹیم

انگلستان کے بچّے بچّے سے متعارف ہو گئی۔ اور عوام کی اکثریت چند دن پیشتر جس ٹیم کے نام سے ناآشنا تھی اس کی شہرت انگلستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور لوگ محسوس کرنے لگے کہ پاکستان کی ٹیم ایک طاقتور ٹیم ہے جو نہ صرف دیگر کاؤنٹیوں کے ساتھ پورے زور شور سے کھیلے گی بلکہ ٹسٹ میچوں میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے گی۔ ہم نے دورے کے فرسٹ کلاس افتتاحی میچ میں ہی ثابت کر دیا کہ "بین الاقوامی کرکٹ کے بچّے" بالغانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور پاکستان کرکٹ کا معیار پست نہیں۔ وُسٹر کے میدان میں ہماری ٹیم نے جس یادگار کھیل کا مظاہرہ کیا اُسے دیکھ کر ہر حلقے سے صدائے تحسین بلند ہوئی اور انگریز قوم کے ہر فرد نے نہایت فراخدلی سے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ایلیف گوور نے کہا "مجھے ان لڑکوں پر فخر ہے۔ صرف دو گھنٹے کی مشق کے بعد دورے کے اوّل سہ روزہ میچ میں پاکستان کی جیت لائق ستائش کامیابی ہے"۔ اخبار "ڈیلی اسکیچ" میں جان مکادم نے الہامی پیش گوئی کرتے ہوئے لکھا کہ جس شخص نے پاکستانیوں کو کھیلتے دیکھا ہے وہ پورے

وثوق سے کہے گا کہ یہ لوگ جتنی ٹیموں سے شکست کھائیں گے اس سے زیادہ ٹیموں کو شکست دیں گے "۔ الغرض پریس میں ایک ہنگامہ برپا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ "ڈیلی میل" نے مقصود کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بے شمار لوگوں نے علیم کی ہٹنگ کو سراہا۔ مانچسٹر گارڈین نے حنیف کو "بوائے ونڈر فرام پاکستان" کا لقب دیا۔ میری باؤلنگ سے متاثر ہو کر مجھے پاکستانی ایلک بیڈسٹر کہا جانے لگا۔ اس خطاب کو سن کر جس انداز میں ایلک بیڈسٹر نے میرے فن پر اظہارِ خیال کیا میں آج بھی اس پر نازاں ہوں۔ اس نے کہا کہ "میں خود انگلستانی فضل محمود کہلوانے کا آرزومند ہوں "۔

انگریزوں کی رواداری اور اعلیٰ ظرفی کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ شام کو جب ہم وُسٹر سے رخصت ہوئے اور کیمبرج پہنچے تو وہاں بھی مبارکباد کی متعدد تاریں موصول ہوئیں ——— بس جی انعام صاحب! اور کوئی میرے لائق خدمت "فضل نے مسکراتے ہوئے نہایت مؤدبانہ طریقے سے کہا! وہ میں حسبِ معمول فائل بغل میں داب شب بخیر کہہ کر گھر چلا آیا۔

۲۵ تاریخ کی شام کو گیا تو خوش قسمتی سے فضل گھر پہ ہی تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور تیار ہو گیا۔ "ہاں جی" فضل نے یاد دہانی چاہی "آپ ویسٹر شائر کو شکست دے کر وہاں سے چل پڑے تھے۔" "ہوں" اور وہ پھر عہدِ رفتہ کی یادوں میں کھو گیا "پہلے ٹسٹ میچ سے قبل" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "پاکستان ٹیم نے ۸ کاؤنٹی میچ کھیلے" اس نے فقرہ پورا کرتے ہوئے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیر دیا۔ "اور وہ کاؤنٹی میچ پی جانے کی صلاح ہے کیا؟" میں نے فوراً پنسل روک لی۔ "اس لئے کہ ان کا کوئی فائدہ نہیں"۔ اس نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ "وہ کیوں؟" میں نے استفسار کیا۔ "کیونکہ اوّل تو کاؤنٹی میچوں کی پوری تفصیل عوام کو معلوم ہے دوسرے اہم چیز ٹسٹ میچ ہے" اس نے وضاحت کرنا شروع کر دی۔ "جس میں ہر ملک کی ٹیم کے پیشِ نظر ملک کا وقار ہوتا ہے۔ اور ٹیم کے جملہ ارکان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ وہ ٹسٹ میں کامیاب رہیں اور ہر قیمت پر ٹسٹ میچ میں کامیابی حاصل کریں"۔ فضل نے باقاعدہ لیکچرار کی حیثیت اختیار کر لی۔ "ٹسٹ میچ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی

بہت زیادہ ہے کہ ٹسٹ میں صرف کھلاڑی کے کھیل ہی کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دو مختلف قوموں کے افراد کا کردار بھی پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان گیارہ کھلاڑیوں کی ٹیم پورے ملک کی نمائندہ جماعت ہوتی ہے۔ ٹسٹ میچ میں کھلاڑی کا مزاج، قابلیت، ذہانت، صبر و استقلال قوتِ برداشت اور عزم کی پختگی سبھی کچھ دنیا کے سامنے ہوتا ہے اور دیکھنے والے یہیں سے اندازہ کرتے ہیں کہ کونسی قوم کس قوم سے برتر اور ترقی یافتہ ہے اور اس کے افراد میں دیگر طاقتور قوموں کے مقابلے میں کس قدر صلاحیتیں موجود ہیں۔" "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بات معقول تھی۔ لہذا میں نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ "بسم اللہ کیجئے۔" میں نے پنسل کو ٹھیک سے پکڑ لیا۔ اور فضل نے بقیہ سگرٹ ایش ٹرے میں مسل کر داستان شروع کر دی۔

"ووسٹر کے بعد ہم نے گیارہ مئی سے لے کر آٹھ جون تک کیمبرج، لیسٹر شائر، آکسفورڈ، ایم سی سی، سسیکس، ہیمپ شائر اور گلیمرگن کے ساتھ کاؤنٹی میچ کھیلے جن میں سے آکسفورڈ میچ ۹ وکٹوں

سے جیتا اور باقی میچ برابر رہے۔ بہر کیف پلّہ پاکستان ٹیم کا بھاری رہا۔ جس وقت ہم گلیمر گن کاؤنٹی کے ساتھ میچ کے آخری دِن یعنی ۸ جون کو ابھی کھیل رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ دوسرے روز ہم لندن پہنچے تو جب بھی بارش جاری تھی اور دس جون کو ہمیں پہلا ٹسٹ میچ کھیلنا تھا۔ خیر انتخابی کمیٹی نے ٹیم چُنی اور حنیف، علیم، وقار، مقصود، امتیاز، کاردار، خالد وزیر، ذوالفقار، شجاع خان محمد اور مجھے شرکت کا موقع دیا گیا۔ انگلینڈ کی ٹیم ہٹن، کامپٹن، ایونز، سمپسن، ایڈرک، بیلے، وارڈل، لیکر، ٹارسل، مے اور سیڈھم پر مشتمل تھی۔ انگلینڈ کے انتخاب کنندگاں نے جیت کو یقینی بنانے کے لئے ایسی مضبوط ٹیم تشکیل دی جس کے آٹھ کھلاڑیوں نے گذشتہ سال اوول کے میدان میں آسٹریلوی ٹیم کے دانت کھٹے کر دیئے تھے اور اُس میچ کے ہیرو تھے۔

ہٹن، کامپٹن اور ایونز میں سے ہر ایک کم از کم پچاس پچاس ٹسٹ میچ کھیل چکا تھا اور ان تینوں کی قابلیت مسلّم تھی۔ پوری کی پوری ٹیم میں صرف پیٹر مے اور سیڈھم ہی ایسے کھلاڑی تھے

جن کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی ورنہ باقی تمام کھلاڑی عمر اور تجربے کے لحاظ سے ہم سے کہیں آگے تھے۔

انگلینڈ کے انتخابی بورڈ کی اس روش کے خلاف پریس میں بھی کافی لے دے ہوئی۔ حتےٰ کہ ڈان ایکسپریس سروس کے بروس پیرس نے اسپورٹس کالم میں طنزیہ لکھا کہ سیفٹی فرسٹ، (حفظِ ماتقدم) کا اصول سڑک پر ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا بے شک مفید ہے لیکن بین الاقوامی کھیل کے میدان میں اس کا استعمال ہمیشہ سود مند ثابت نہیں ہوتا۔

مخالف ٹیم کی مضبوطی کا احساس ہمیں بھی تھا مگر ہم نے حوصلے نہ ہارے اور دس جُون کو صبح ساڑھے دس بجے کے قریب ہماری ٹیم بس میں بیٹھ کر برنز ہوٹل سے لارڈز گراؤنڈ کو روانہ ہو گئی جو ہوٹل سے تقریباً ڈیڑھ میل دُور ہے۔

اُس دن خلافِ معمول تمام کھلاڑیوں کے چہرے غیر معمولی سنجیدگی کی غمازی کر رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ ہر ایک کو یہ احساس تھا کہ وہ پہلا ٹسٹ میچ کھیلنے جا رہا تھا اور آج بین الاقوامی میدان میں دو قوموں کی صلاحیتوں کا امتحان ہے —— اگر پاکستان

کامیاب نہ ہو سکا تو ــــ بس شور مچاتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی اور پاکستان ٹیم کے کھلاڑی بالکل ساکت و جامد بیٹھے دل ہی دل میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ میں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اس دُھن میں لگا رہا کہ کسی بہانے فضا کا بوجھل پن دُور کرنے کی کوشش کروں تاکہ کھلاڑیوں میں قدرے جوش اور اعتماد پیدا ہو جائے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ معاً مجھے جذبی کا ایک شعر یاد آ گیا اور میں نے بلند آواز میں الاپنا شروع کر دیا۔

اے برقِ تجلّی کوندذرا ایسں موسیٰ نہیں جو ڈر جاؤں
مَیں طور نہیں جو جل جاؤں جو چاہے مقابل آ جائے

میرے شروع کرنے کی دیر تھی کہ یکے بعد دیگرے سب نے مل کر قوالی کی صورت میں گانا شروع کر دیا اور چند لمحوں کے لئے آزمائش کا احساس ہمارے دلوں سے جاتا رہا۔ ہم اسی طرح ہنستے ہنساتے گراؤنڈ میں پہنچے اور سیدھے ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بالکنی میں سے جھانک کر گراؤنڈ پر نظر ڈالی اور مجھے یقین ہو گیا کہ آج میچ نہیں کھیلا جا سکتا۔ کیونکہ گذشتہ دو

دنوں کی لگاتار بارش سے گراؤنڈ کافی گیلی تھی اور اگرچہ وکٹ کو چوبیس گھنٹے پیشتر لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا لیکن لارڈز کی گراؤنڈ چونکہ شمالاً جنوباً ڈھلوان ہے لہٰذا حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود پانی تختوں کے نیچے سے رِستا رہا اور وکٹ کھیل کے ناقابل ہوگئی۔

ساڑھے گیارہ بجے کاردار اور ہٹن نے وکٹ کا معائنہ کیا مگر اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ تین گھنٹے ٹھہر کر پھر وکٹ کا جائزہ لیا جائے اور اگر وہ خشک ہو جائے تو کھیل شروع کر دیا جائے۔

انتظار کی کوفت سے اُکتا کر ہم نے دوپہر کا کھانا بھی شغلِ بیکاری کے طور پر مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ پہلے کھانا شروع کر دیا۔ ابھی ہم کھانے کی میز پر ہی تھے کہ پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی اور دونوں کپتانوں نے باہم مشورہ کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے بلا تامل میچ کے التوا کا فیصلہ کر دیا۔

خیال تھا کہ بارش تھوڑی دیر تک رک جائے گی مگر رحمتِ باری

بھی کچھ ایسے جوش میں آئی کہ گیارہ اور بارہ کو بھی میچ نہ کھیلا جا سکا۔ تیرہ کو اتوار تھا اور انگلستان میں اتوار کے روز کرکٹ نہیں کھیلی جاتی چنانچہ ہم اس دن بھی فارغ رہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس دن بارش تھمی رہی اور اب اگلے دن یعنی چودہ تاریخ کو کھیلنے کا امکان قوی ہو گیا۔ چودہ کو ہم گراؤنڈ میں پہنچے تو پچ کی حالت کے مدِ نظر پونے چار بجے تک کھیل کے آغاز کا اعلان کیا گیا۔ پونے چار بجے کے قریب لارڈز میں تقریباً ۔۔۔ تماشائیوں کا اجتماع ہو گیا۔ شائقین میں ایلف گوور، عزت مآب اصفہانی، سابق کمانڈر انچیف جنرل گریسی اور انگلستان کے سینکڑوں لارڈز بھی تھے۔ وقتِ مقررہ پر قرعہ اندازی ہوئی اور پیشروی کا موقع ہٹن کو مل گیا۔ ہٹن نے کمال دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ٹاس جیتنے کے باوجود پاکستان کو بیٹنگ کی دعوت دی۔ کیونکہ وکٹ بتدریج خشک اور باؤلرز کے موافق ہو رہی تھی۔ پاکستان کی طرف سے حنیف اور علیم الدین کو بیٹنگ کا آغاز کرنے کے لئے بھیجا۔ اُدھر سے بیلے اور سیڈھم گیند اندازی کے لئے نکلے مگر ہٹن نے یہ بھانپ کر کہ وکٹ اس وقت سپن باؤلرز

کے لئے مفید ہے۔ جلد ہی انہیں واپس بلالیا اور اپنے سپن باؤلرز وارڈل اور لیکر کو باؤلنگ کے لئے بھیجا۔ میں بالکنی میں بیٹھا تمام نقشہ دیکھ رہا تھا جب آخرالذکر کھلاڑی میدان میں کھیلنے آئے تو میں کفِ افسوس مل رہا تھا کہ کاش ایسی وکٹ پہ گیند پھینکنے کا موقع مجھے ملتا۔

وارڈل نے جب باؤلنگ شروع کی تو اس کے لیگ بریک ہمارے بیٹسمین کے لئے وبالِ جان بن گئے کیونکہ وہ "چپ دست" کھلاڑی ہونے کے باعث بائیں ہاتھ سے کھیلتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے علیم الدین کو ٹھکانے لگایا اور اس کے بعد جلد ہی وقار حسن کو بھی پویلین میں بھیج دیا۔ اس اثنا میں تبدیلئ موسم کے آثار نظر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ بادلوں نے آسمان کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔ دن کی روشنی بالکل مدھم پڑ گئی اور بیٹسمین کی نگاہ گیند کا تعاقب کرنے میں دشواری محسوس کرنے لگی۔ بہرحال وقار کی جگہ مقصود کو بھیجا گیا لیکن اُسے بھی چند لمحے بعد وہیں لوٹنا پڑا جہاں سے وہ چلا تھا۔ اب امتیاز کی باری تھی۔ اس نے ٹیم کے کھلاڑی پے در پے ناکام ہوتے دیکھ کر محض وقت کٹی شروع کر دی اور ہر ممکن

کوشش کی کہ وہ شام ۶ ½ بجے تک جما رہے جب تک کہ کھیل کا وقت ختم نہیں ہو جاتا۔ موسم پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو رہا تھا کالے کالے بادلوں کے قافلے ہر سمت رواں دواں تھے اور آسمان کا ذرا سا حصّہ بھی نظر نہ آتا تھا جس کے باعث گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور امپائرز کو وقت مقرّرہ سے دس منٹ پیشتر اس روز کے کھیل کو ختم کرنا پڑا۔

اس دن پاکستان کی طرف سے حنیف نے بے پناہ صبر و استقلال اور مسلّمہ فنی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ایسی وکٹ پر شام تک کھیل جاری رکھا جو بلاشبہ باؤلرز کے لئے مفید تھی۔ اس نے اتنی دیر اپنے منفرد انداز میں کھیل کر ثابت کیا کہ وہ دنیا کے چند گنے چنے کھلاڑیوں میں سے ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی قابلیّت کا سکّہ بٹھایا بلکہ پاکستان کو شکست سے بچا لیا۔ اگر حنیف اس دن فوراً مات کھا جاتا تو پاکستان ٹیم کے ماندہ ارکان کا آؤٹ ہو جانا یقینی امر تھا۔ اس نے ۱۵۰ منٹ میں ۱۱ رنز بنا کر وہی مقام حاصل کر لیا جس کا اہل آسٹریلوی کھلاڑی ڈبلیو۔ ایل۔ مرڈک تھا۔ جس نے ۱۸۸۲-۸۳ء میں انگلستان

کے خلاف کھیلتے ہوئے ۱۵۰ منٹ میں ۱۹ رنز بنائیں۔ انگلستان کی طرف سے اس دن وارڈل نے اچھے کھیل کی نمائش کی۔ اس نے ۲۱ اوور پھینکے جن میں سے تین میڈن رہے اور ۲۱ رنز میں تین وکٹیں حاصل کر کے باؤلنگ آنرز لے لئے۔

ٹسٹ میچ کا آخری دن سنسنی خیز تھا۔ ہر دو ٹیموں کے کھلاڑی مضطرب تھے کہ دیکھیں کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے —— چنانچہ ہماری طرف سے حنیف اور امتیاز بیٹنگ کے لئے نکلے اور ادھر سے بیکر اور وارڈل نے باؤلنگ شروع کی۔ بیکر نے اس روز امتیاز کو زیادہ دیر نہ ٹھہرنے دیا اور اسے صرف ۱۲ رنز کے حصول کے بعد میدان سے رخصت ہونا پڑا۔ امتیاز کی ناکامی پر کاردار نے بیٹ سنبھالا اور جاتے ہی . . . .

. . . . بیکر کی گیند کو ہٹ لگائی اور دو رنز بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہٹن نے بیکر کا وار خالی دیکھا تو فوراً باؤلرز تبدیل کر دیئے اور بیکر اور

وارڈل کی جگہ سٹیدھم اور ٹار سل کھڑے کر دیئے۔ سیڈھم نے آتے ہی نہایت شدت کے ساتھ کاردار کو گیندیں پھینکنی شروع کیں۔ کاردار نے اس کے پہلے اوور کی پانچ گیندوں کو پیٹنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر نہ تو کاردار ہٹ لگا سکے اور نہ ہی سیڈھم اپنی حسرت پوری کر سکا بالآخر سیڈھم نے ایک اور حربہ استعمال کیا اور پہلے اوور کی آخری گیند "یارکر" پوری قوت سے وکٹوں کے درمیان دے ماری اور کاردار کو کریز چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کاردار کے بعد میں، خالد، خان محمد، ذوالفقار اور شجاع الدین باری باری گئے مگر سیڈھم اور وارڈل نے ہم پانچوں کھلاڑیوں کو اپنے اسکور میں بمشکل ۱۹ رنز کا اضافہ کرنے کی مہلت دی اور پاکستان کی کل ٹیم ۸۷ رنز بنا کر لنچ کا وقت شروع ہونے سے پہلے آؤٹ ہو گئی۔

انگلستان کی طرف سے ہٹن اور سمپسن نے اپنی پہلی اننگز کا آغاز کیا اور پاکستان کی طرف سے میں اور خان محمد قسمت آزمائی کے لئے نکلے۔ میں نے پاکستان باؤلنگ کا افتتاح کرتے ہوئے پہلا اوور سمپسن کو پھینکا اور سمپسن چھ رنز بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنے

کنارے سے میں نے دوبارہ ہٹن کو کھلانا شروع کیا اور میرا دوسرا اوور بھی میڈن رہا۔ خان محمد نے اپنے دوسرے اوور کی ابتدا کی اور چوتھی گیند پر سمپسن پھر ایک دوڑ کا موقع پا گیا اور اس تبدیلی سے خان محمد کے مدِ مقابل ہٹن پہنچ گیا۔ خان محمد نے اس مرتبہ اپنی فنی چابکدستی کا پورا پورا مظاہرہ کیا اور وہی "یارکر" گیند جس کے سہارے ڈیمم نے ہمیں پچھاڑا تھا ہٹن کے بیٹ کے بالکل قریب پھسلنے لگی۔ گیند لمحہ بھر کے لئے ہوا میں گھومی اور سیدھی وکٹوں سے جا بغلگیر ہوئی اس نظارے کو دیکھ کر پاکستان اسٹینڈ سے قیامت کا شور اٹھا فضا "شاباش" "شاباش" کے فلک بوس نعروں سے گونجنے لگی اور دوسرے لمحے کپتان ہٹن بغیر کوئی رنز بنائے بے نیل و مرام واپس جا رہا تھا۔

ہٹن کا خلا نائب کپتان پیٹر مے سے پُر کیا گیا اور مے نے سمپسن کے ساتھ مل کر بہترین کھیل کی نمائش کی۔ ان دونوں کھلاڑیوں کو ایک سہولت یہ ملی کہ وکٹ جو کچھ عرصہ قبل باؤلرز کے لئے مفید تھی رفتہ رفتہ خشک ہونے کے باعث بیٹسمین کی اعانت

کرنے لگی تھی۔ چنانچہ پیٹر مے اور سمپسن نے تیز رفتاری کے ساتھ اپنے اسکور میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ سمپسن کے ۲۰ رنز بنانے تک میں اس کے انداز کو بغور مطالعہ کرتا رہا لہٰذا میں نے موقع پاتے ہی اپنی مخصوص گیند لیگ کٹر اُس کی 'لیگ سٹمپ' پر دے ماری۔ سمپسن لیگ کی طرف ہٹ لگانے کے لیئے نہایت سرعت سے گھوما لیکن گیند بجائے بیٹ کا نشانہ بننے کے اس کے پیڈز کی طرف بڑھی اور سمپسن ایل۔بی۔ڈبلیو کا شکار ہو کر آرام گاہ میں چلا گیا۔

سمپسن سے ہاتھ دھو کر ہٹن نے کامپٹن کو میدان میں بھیجا جس نے بیٹ سنبھالتے ہی انگلستان کے اسکور میں جلد از جلد اضافہ کرنے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی کیونکہ انگریز کھلاڑیوں کی دلی تمنا تھی کہ وہ ٹسٹ میچ میں ہر قیمت پر کامیابی حاصل کریں اور کم سے کم وقفے میں زیادہ سے زیادہ رنز بنا کر اپنا کُل اسکور پاکستان سے زائد کر لیں چنانچہ میں نے جب گیند اندازی شروع کی تو اُس نے دو مرتبہ بڑھ بڑھ کر ہٹ لگانے کی سعی کی مگر ناکام رہا۔ تیسری بار اس نے پھر بھی مشق

دُہرائی لیکن میری لیگ کٹر گیند کامپٹن کو جل دے کر اس کی وِکٹ کا کام تمام کر گئی اور کامپٹن رنز بنانے کی حسرت دل ہی میں لئے گراؤنڈ سے چل دیا۔

کامپٹن کے بعد ایڈرک آیا۔ میں نے اسے پہلی گیند پھینکی اور سلپ کی طرف کیچ نکلا لیکن شومئ قسمت کہ خان محمدؐ نے کوشش کے باوجود کھو دیا اور وہ باؤنڈری بنا کر دوسرے کنارے پر جا پہنچا جس طرف سے خان محمدؐ نے باؤلنگ کرنی تھی۔ خان محمد ابھی تک "یارکر" کا حربہ استعمال کر رہا تھا۔ اس نے یہی گیند ایڈرک کو پھینکنی شروع کی اور اُسے مزید رنز بنانے کی مہلت دیئے بغیر ناکام بنا دیا۔

خان محمدؐ اُس دن بڑی محنت اور ہوشیاری سے کھیل رہا تھا اور لگاتار انگریز کھلاڑیوں کو ٹھکانے لگاتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ہٹن، ہیڑمے، اور ایڈرک کے بعد ایونز اور بیلے کو بھی ناکام بنا کر پویلین میں بھیج دیا۔

میری اور خان محمدؐ کی یہی کوشش تھی کہ مخالف ٹیم کے زیادہ سے زیادہ کھلاڑی بیکار کر دیئے جائیں چنانچہ ہم دونوں اسی جدّوجہد میں

لگے ہوئے تھے۔ کاردار برابر کھیل کا جائزہ لے رہے تھے لہٰذا جس
وقت ایونز اور وارڈل کھیل رہے تھے وہ میرے پاس آئے اور مشورہ
دیا کہ بیٹسمین کو آؤٹ کرنے کی بجائے وقت کٹی کی کوشش کی جائے
تاکہ میچ برابر ہو جاتے۔ میں چونکہ میدان میں کھیل رہا تھا اور بڑی دیر
سے انگریز کھلاڑیوں کے کھیل اور ان کی نفسیاتی کیفیت کا مطالعہ
کر رہا تھا لہٰذا میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے
بہر قیمت مخالف کھلاڑیوں کی پسپائی پر زور دیا۔ کاردار میری رائے
سے اتّفاق کر گئے۔ اور مَیں اور خان محمدؐ وارڈل اور ایونز کو کھلانے
میں مشغول ہو گئے۔ یہ دونوں کھلاڑی ہماری ہر گیند کو ہٹ لگانے
کی لگاتار کوشش کر رہے تھے اور زیادہ سے زیادہ رنز بنانے کی فکر میں
تھے۔ اگر میں اس وقت انہیں آؤٹ کرنے کا خیال ترک کر کے گیند
کو وکٹ سے دور پھینکنا شروع کر دیتا اور انہیں آؤٹ کرنے کی
جدّوجہد چھوڑ دیتا تو نہ صرف وہ ڈٹے رہتے بلکہ انہیں رنز بنانے میں
بھی کافی مدد ملتی۔ چنانچہ میں نے معمول کے مطابق کھیلتے ہوئے پہلے
وارڈل کو میدان سے رخصت کیا اور پھر سٹیدھم کو۔ اور آخر کار

انگلستان کی کل ٹیم ۱۱۱ رنز کے عوض گراؤنڈ سے آؤٹ ہو گئی۔ پاکستان کی دوسری اننگز کا آغاز پھر حنیف اور علیم نے کیا۔ انگلستان کی طرف سے لیکر اور بیلے نے باؤلنگ شروع کی اور پاکستان کے بیٹسمین ایک مرتبہ پھر نازک دور سے گزرنے لگے۔ بیلے نے علیم کو کوئی رنز نہ بنانے دیں اور اسے دوسرے اوور میں آؤٹ کر دیا۔ بہر حال حنیف اور وقار نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور ہٹن کی یہ موہوم اُمید کہ وہ قلیل عرصے میں ٹسٹ میچ جیت لے گا خاک میں مل گئی۔ حنیف اور وقار کے علاوہ مقصود نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور پہلا ٹسٹ میچ حسبِ توقع برابر رہا۔ اگرچہ پہلے ٹسٹ میچ کا کھیل صرف ۱½ دن جاری رہ سکا تاہم پاکستانی کھلاڑیوں نے محسوس کیا کہ انگریز کھلاڑی مبالغے کی حد تک مشاق ہیں اور ان سے میچ جیتنا ماؤنٹ ایورسٹ کو فتح کرنے کے برابر ہے۔" آخری جملہ لکھنے کے بعد میں نے فائل وغیرہ سمیٹی اور گھر چلا آیا۔

۲۶ اور ۲۷ کی شامیں پھر فضل محمود کی مصروفیات کی نذر ہو گئیں

۲۸ کو فردوس نگر پہنچا۔ دروازے پر دستک دی اور جواب کے
انتظار میں تاریک گلی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں
سے رفیع کی پُرسوز آواز ہوا کے دوش پر تیرتی میرے کانوں سے ٹکرا
رہی تھی اور نوشاد کی گلوکاری نے مجھے چند ثانیوں کے لئے مسحور
کر دیا۔ "تمرے دوار کا ہیں ہوں . . . . ." دروازہ کھلنے کے ساتھ
ہی رفیع کی بلند آواز نے میرا پُرجوش خیر مقدم کیا "کون صاحب
ہیں"۔ فضل کے سب سے چھوٹے بھائی اندھیرے میں مجھے شناخت
کرنے کی کوشش کر رہے تھے "انعام" اور وہ آواز پہچان کر پھر
اندر چلے گئے۔ "تشریف لائیے" وہ دوبارہ نمودار ہوئے اور دوسرے
لمحے میں صوفے پر بیٹھا بیگم فضل کی مزاج پرسی کر رہا تھا۔ بڑی بھابی
اور کمسن دیور فضل کے انتظار میں بیٹھے موسیقی سے دل بہلا رہے
تھے۔ جب تک ریکارڈ بجتا رہا میں نے تکلّف تخاطب مناسب
نہ سمجھا اور خود بھی رفیع کی گلوکاری سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اور
جب اُس نے آخری بار "من تڑپت ہری درشن کو آج" کا الاپ
کر کے تان توڑی تو میں نے فوراً پوچھا۔ "فضل صاحب کہاں

ہیں۔" "بدستور عنقا ہیں"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ شاید انہیں
میری حالت پر رحم آ رہا تھا اور یہ کہہ کر انہوں نے اِدھر اُدھر بکھرے
ہوئے متعدد ریکارڈ اور گراموفون دیور کے ہاتھ اندر بھجوا دیے
میں نے جل بھن کر سگریٹ سلگایا اور غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے لمبے
لمبے کش لگانے شروع کر دیئے۔ "بھابی جی!" میں نے غصہ نکالنے کی
ایک اور سبیل نکالی اور فضل کی غیبت پر کمربستہ ہو گیا۔ "فرمائیے"
بھابی نے اُون اور سلائیاں پاس ہی صوفے پر رکھ دیں اور سیاہ چسٹر
کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ "یہ ـــ فضل صاحب
کا اوّل ہیرو ہونا آپ کے لئے تو یقیناً عذاب جان ہے"۔ میں
نے ذاتی جذبات کی تائید ان کے منہ سے کرانے کی خاطر مثبت
لہجہ اختیار کیا اور ان کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی
"ہرگز نہیں" انہوں نے نفی میں گردن ہلائی اور میں دانت پیس کر
رہ گیا کہ جذباتی تسکین کا آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ تاہم میں نے
ہمت نہ ہاری اور پھر محوِ کلام ہو گیا۔ میں نے دورانِ گفتگو لاکھ کوشش
کی کہ ان کی زبان سے ایک آدھ مخاصمانہ فقرہ نکل جائے اور میری

تشفی ہو جائے لیکن انہوں نے اُلٹا میرے تمام سوالات کا جواب
نہایت سنجیدگی سے دینا شروع کر دیا اور میں ان کو ہمنوا بناتا بناتا
اُن کی عظمت کا قائل ہوتا چلا گیا۔ جب میں نے پہلی بار انہیں
جمخانہ ٹینٹ میں دیکھا تو میری نظر میں ان کی وقعت بیگم فضل سے
زیادہ نہ تھی۔ اس ملاقات کی ابتدا میں میں نے اُنہیں فقط رسمی بھابی
کی حیثیت دی لیکن نصف گھنٹہ کی نشست کے بعد میں انہیں
عظیم ماننے پر مجبور ہو گیا ——— عظیم باؤلر کی عظیم شریکِ حیات
مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج، ایک بیدار مغز، باوقار اور معزز
خاتون ——— جس کی آغوش میں پرورش پانے والا اشاہد محمود بلاشبہ
کل کا بریڈمین ہے ——— سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے جب
میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا فضل کی مصروفیات آپ کی ازدواجی
زندگی پر ناخوشگوار اثر نہیں چھوڑتیں تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں کہنے
لگیں اس میں شک نہیں کہ فضل کی اکثر و بیشتر غیر حاضری میرے
لئے اچھی خاصی حد تک تکلیف دہ ہے۔ اور اگر میں ذات پرستی پر
آجاؤں تو ایک منٹ کے لئے بھی نباہ مشکل ہو جائے لیکن جب میں

سوچتی ہوں کہ فضل پر اس کے شائقین ـــــ اس کی قوم اور اس کے ملک کا بھی یکساں حق ہے تو میں ذرّہ برابر دلشکنی محسوس نہیں کرتی اور ان کے راستے میں رکاوٹ بننے کی بجائے ان کی معاونت اپنا فرض سمجھتی ہوں میں نے ہمیشہ ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ گھر میں بھی اور کھیل کے میدان میں بھی اور میری یہ دلی تمنّا ہے کہ وہ اپنے ملک کا نام روشن کرنے کے لئے پاکستان اور آٹھ کروڑ پاکستانیوں کی جتنی بھی خدمت ہو سکے کرنے سے دریغ نہ کریں چاہے مجھے زندگی کا بیشتر حصّہ یکہ و تنہا کیوں نہ گذارنا پڑے ـــــ اور یہ کہنے کے بعد بھابی خاموش ہو گئیں ـــــ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے سکوت طاری ہو گیا ـــــ اور میں سوچنے لگا کہ فضل واقعی خوش قسمت ہے ـــــ جسے زندگی میں ہر شے میسّر ہے ـــــ "اور کچھ ـــــ" وہ مسکراتے ہوئے بولیں ـــــ کچھ بھی تو نہیں ـــــ میں نے دل میں سوچا ـــــ کیونکہ میں بالکل خالی الذہن ہو چکا تھا ـــــ اور جس مقصد کے لئے بات چھیڑی تھی وہی فوت ہو گیا ـــــ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ

میری رگِ انٹرویو رائیٹنگ پھڑکی اور میں نے سوچا کہ شہزادہ صاحب تو ابھی تک تشریف نہیں لائے لہٰذا کیوں نہ فضل کے ساتھ ساتھ اسی بہانے بیگم فضل کا بھی انٹرویو لے لیا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سوالات کی بوچھاڑ کردی اور ان کی شادی سے پہلے اور بعد کے سبھی واقعات پوچھ ڈالے جن کا فضل کی ذات سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا تاکہ فضل کی زندگی کے ہر پہلو کی نقاب کشائی ہو جائے —— میرے تمام سوالات سن کر بھابی نے کچھ عرصہ توقّف کیا اور پھر ایک مربوط سلسلے میں جواب دینا شروع کر دیئے۔ کہنے لگیں: "کرکٹ کا شوق مجھے ورثہ میں ملا ہے کیونکہ ڈیڈی کرکٹ کے کھلاڑی ہیں۔ میں ذرا بڑی ہوئی تو ڈیڈی مجھے اور بھائی جان یاور سعید کو خود کرکٹ سکھایا کرتے اور اس طرح کرکٹ کے ساتھ میری دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔ گھر میں چونکہ بیٹنگ کا چرچا تھا لہٰذا مجھے بھی زیادہ رغبت بیٹنگ سے تھی۔ بچپن میں مجھے ہر قسم کی کرکٹ دیکھنے کا اتّفاق ہوا لیکن سب سے پہلا میچ جو مجھے پسند آیا وہ آسٹریلیا سروسز الیون اور این آئی سی اے کے درمیان

تھا۔ یہیں میں نے محمود کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے ایک اور میچ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں یونیورسٹی الیون محمود صاحب کی قیادت میں گورنرز الیون کے ساتھ کھیلی۔ اس میچ میں محمود بہترین بیٹنگ کا مظاہرہ کر رہے تھے اور چونکہ مجھے بھی بیٹنگ زیادہ مرغوب تھی لہٰذا میں دل ہی دل میں ان کے کھیل کو خوب سراہ رہی تھی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں مستقبل میں اس عظیم باؤلر کے دامن سے وابستہ ہو جاؤں گی ـــــ بہر حال ۱۶ جون ۱۹۴۷ کو میری شادی ہو گئی اور محمود کے قرب نے مجھے رفتہ رفتہ باؤلنگ سے بھی مکمّل طور پر روشناس کرا دیا اور آج میں مسرور ہوں کہ فرائضِ خانہ داری کے ساتھ ساتھ انہیں کھیل کے معاملے میں بُرے بھلے مشورے بھی دینے کے قابل ہوں" ـــــ اتنا بتانے کے بعد وہ تھوڑی دیر کو رُکیں اور پھر گویا ہُوئیں۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ بھارت کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ میچ کھیلنے والے تھے تو میں نے انہیں بذریعہ خط، وِکٹیں حاصل کرنے کی پُر زور تحریک کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی تقاضا کیا کہ ان سات میں سے ایک وِکٹ

امرناتھ کی ہو۔ چنانچہ میچ کے اختتام پر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ انہوں نے میری بات پوری کر دی۔ لکھنؤ کے بعد جب کلکتے پہنچے تو میں نے پھر انہیں کم از کم چار وکٹیں اکھیڑنے کے لئے لکھا اور انہوں نے تین وکٹیں حاصل کرنے کے بعد چوتھی کے لئے خاصی جدّوجہد کی ——— رفتہ رفتہ مجھے ان کے کھیل پر اس قدر اعتماد ہو گیا کہ میں نے اوول میچ کے اختتام سے قبل ہی انہیں مبارکباد کی تار بھیج دی کیونکہ وہ انگلستان جانے سے پہلے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ کر گئے تھے کہ ایک ٹسٹ میچ میرا ہے ——— چنانچہ اوول کی جیت کے فوراً بعد انگلینڈ سے ڈیڈی اور بھائی جان کی ٹیلیگرام نے میرے یقین کی تائید کر دی۔ جس میں لکھا تھا فضل کے ہاتھوں انگلستان کی شکست مبارک ہو ———" اور بھابی یہ سب کچھ بتانے کے بعد پھر سلائیاں لے کر سویٹر بننے میں مشغول ہو گئیں۔ ——— میں نے پھر دریافت کیا "شاہد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" ان کی متحرک سلائیاں تھوڑی دیر کے لئے رک گئیں۔ "شاہد کی پیدائش پر اس کے ڈیڈی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا

تھا کہ ایک اور بریڈمین نے جنم لیا ہے —— خدا کرے کہ یہ کرکٹ میں وہ مقام حاصل کرے جو ڈان بریڈمین کو حاصل ہے" ——

اور بھابی کی نظریں شاہد کی فوٹو پر جم گئیں جو پاس ہی میز پہ پڑی تھی

—— میں نے گھڑی کی طرف دیکھا ۹ بج چکے تھے —— اور میں مایوس ہو کر بھابی سے رخصت لے کر باہر نکل آیا —— "کہاں چل دیئے جناب۔" یہ فضل صاحب تھے جو میرے تیور دیکھ کر گلی سے ہی شروع ہو گئے۔" پہلے ٹسٹ میچ سے فارغ ہو کر ....

اور مجھے اس کے تجاہلِ عارفانہ پر ہنسی آ گئی کہ کس انداز سے مجھے پلستر لگایا جا رہا ہے۔" یہ انعام صاحب تو آج بیزار ہو کر چل دیئے تھے۔" ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی بھابی بولیں"۔ ابھی سے دل چھوڑ گئے انعام صاحب" فضل نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا اور قبل اس کے کہ میں کچھ تلخ ترش کہوں اس نے صوفے پہ بیٹھ کر داستان کا آغاز کر دیا۔ اور بھابی ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔

"پہلے ٹسٹ میچ سے فارغ ہو کر ہم ۱۶ جون کو اسکاٹ لینڈ

کاؤنٹی کے خلاف ایڈنبرگ میں کھیلے اور میچ ۱۰ وکٹوں سے جیت گئے۔ اس کے بعد ٹرینٹ برج میں نوٹنگھم شائر سے دو دو ہاتھ ہوئے اور ہمیں ۸ وکٹوں سے پھر کامیابی نصیب ہوئی۔ یہاں سے فراغت پا کر کمبائنڈ سروسز والوں کے ساتھ مقابلہ ہوا اور میچ برابر رہا۔ چنانچہ خوشی خوشی شفیلڈ پہنچے تاکہ یارک شائر سے بھی قوت آزمائی کریں لیکن افسوس کہ پاکستان کو یہ میچ ۹ وکٹوں سے ہارنا پڑا۔ یارک شائر میں شکست کوئی اچھا شگون نہیں تھا کیونکہ اس کے بعد ہمیں دوم ٹسٹ میچ کھیلنا تھا اور اندیشہ تھا کہ ہمارے کھلاڑی حوصلے پست نہ کر بیٹھیں۔ حسن اتفاق سے اس میچ میں ہمارے بہترین باؤلرز شرکت نہ کر سکے لہٰذا سبھی نے اس شکست کو مذکورہ کمزوری پہ محمول کرتے ہوئے کوئی خاص اثر نہ لیا۔ اور ہم مطمئن ہو گئے کہ دوسرا ٹسٹ میچ پورے اعتماد اور دلجمعی سے کھیلا جائیگا۔

اسی اثنا میں انگلستان کی نئی ٹیم کا انتخاب عمل میں آیا اور کافی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ ہٹن چونکہ علالت کے سبب کھیل کے ناقابل تھا لہٰذا انگلستان کی قیادت شیپرڈ کے سپرد کی گئی۔

اس کے علاوہ ایڈرک، لیکر اور ٹارسل کی بجائے گریونی، بیڈسر اور اَیپل یارڈ کو موقع دیا گیا۔ انگلستان کے انتخابی بورڈ نے اس مرتبہ بھی جیت کو یقینی بنانے کی حتی الامکان کوشش کی اَور شیپرڈ، سمپسن، مے، کامپٹن، گریونی، بیلے، ایونز، وارڈل، سٹیدھم، اپیل یارڈ اور بیڈسر پر مشتمل اتنی مضبوط ٹیم تشکیل دی جتنی کہ انگلستان کو میسّر آسکتی تھی۔ ہماری ٹیم میں بھی کافی ردّوبدل ہوا۔ خالد، وزیر، شجاع، ذوالفقار اور محمود حسین کے بدلے غزالی اسلم اور خالد حسن کو آگے بڑھایا گیا۔ القصہ پاکستان کی انتخابی کمیٹی نے جس میں سیّد فدا حسن، کاردار اور میں شامل تھے پاکستان ٹیم کا انتخاب کیا اور کاردار کے اور میرے علاوہ حنیف، مقصود، امتیاز، علیم، غزالی، اسلم، وقار، خالد حسن اور خان محمدؐ کو شرکت کا موقع دیا گیا۔ چنانچہ مورخہ یکم جولائی ۱۹۵۴ کو نوٹنگھم کی ٹرینٹ برج گراؤنڈ میں دوئم ٹسٹ میچ کا آغاز ہوا جسے دیکھنے کے لئے کم وبیش بیس ہزار تماشائی موجود تھے۔ کاردار نے ٹاس جیت کر پہلے بیٹنگ کرنی مناسب سمجھی اور پاکستان کی اوّل اننگز کا افتتاح کرنے کے لئے

حنیف اور علیم کو بیڈ سر اور سٹیڈ ھم کے مدِمقابل بھیجا۔ علیم الدین ابھی چار ہی رنز بنا پایا تھا کہ سٹیڈ ھم نے اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے علیم کی وکٹ اکھاڑ پھینکی۔ علیم کی جگہ وقار سے پُر کی گئی اور اُدھر سے شیپرڈ نے بھی کچھ سوچ کر سٹیڈ ھم کی بجائے فاسٹ باؤلنگ اور سپننگ دونوں کے ماہر خوبصورت اور دراز قد ایپل یارڈ کو گیند اندازی کرنے کی ہدایت کی جس نے آتے ہی اپنی فنی چابکدستی کا عملی ثبوت بہم پہنچایا اور حنیف کو ایل۔ بی۔ ڈبلیو کا نشانہ بنانے کے بعد وقار، مقصود اور امتیاز کو یکے بعد دیگرے آرام گاہ میں بھیجتا رہا اور ان چاروں کھلاڑیوں کو بالترتیب ۱۹، ۷، ۶ اور ۱۱ سے زائد رنز بنانے کی مہلت نہ دی۔ ایپل یارڈ نے اس دن بینظیر باؤلنگ کی نمائش کی اور تماشائیوں کو حد درجہ محظوظ کیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نت نئے انداز سے گیند پھینکنے کا عادی ہے اور ضرورت کے مطابق نیا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ میں اس کے کھیل کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ گیند تیزی سے پھینکتے وقت "سیم" کا استعمال کرتا اور جب سُست رفتار گیند اندازی مطلوب ہوتی تو گیند کو "آف"

کی طرف سے گھماتا۔ اس کی متنوع باؤلنگ نے پاکستانی کھلاڑیوں
کو الجھن میں ڈال دیا۔ ہمارا جو بھی کھلاڑی اس کے ہاتھوں شکست
کھا کر پیویلین میں لوٹتا اس کی زبان پر یہی الفاظ ہوتے کہ ایپل یارڈ کا
کھیل کوئی خاص پیچیدہ تو نہیں مگر نہ معلوم وہ آؤٹ کیسے کر لیتا ہے۔
بات اور اصل یہ تھی کہ ہمارے بیٹسمین اس کی باؤلنگ کے وقت پیچھے
ہٹ کر کھیلنے کی کوشش کرتے لیکن ایپل یارڈ کی گیند وکٹ سے ٹکرا
کر ذرا تیز رفتار ہو جاتی۔ لہٰذا وقفے کے متعلق بیٹسمین کا اندازہ غلط
بیٹھتا اور گیند اور بیٹ کی بروقت ملاقات نہ ہو سکتی۔ ایپل یارڈ کو
ناکام بنانے کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ہمارے بیٹسمین بلا
خوف و خطر آگے بڑھ بڑھ کر اس کی گیندوں کو پیٹنے کی کوشش کرتے۔

ایپل یارڈ پاکستان کی پہلی اننگز میں سب سے زیادہ کامیاب
باؤلر رہا اس نے خالد حسن سمیت ہمارے پانچ کھلاڑی کھیلنے سے
محروم کر دیئے۔ سٹیتھم نے علیم الدین کے علاوہ غزالی کو بھی پسپا کیا
مجھے اور کاردار کو بیڈسر لے بیٹھا اور اسلم وارڈل کے ہتھے چڑھ
گیا۔ چنانچہ چائے کے وقت سے کچھ دیر پہلے پاکستان ٹیم اپنے دامن

میں صرف ۱۵۰ رنز کا عطیہ سمیٹ کر اپنی پہلی اننگز سے دستبردار ہو گئی۔

اتنے تھوڑے سے اسکور کے عوض ہماری پوری ٹیم کی ناکامی کا سبب میرے نزدیک صرف یہی ہے کہ ہمارے بیٹسمین گھبراہٹ کے باعث اپنے صحیح کھیل کا مظاہرہ نہ کر سکے ورنہ نہ تو باؤلنگ ہی کوئی بہت زیادہ زبردست تھی اور نہ ہی وکٹ باؤلرز کو غیر معمولی سہولت بہم پہنچا رہی تھی۔

ہمارے میدان چھوڑنے کے بعد سمپسن اور شیپرڈ نے انگلستان کی پہلی اننگز کی ابتدا کی جن کے مقابلے پر پاکستان کی طرف سے میں اور خان محمد گراؤنڈ میں گئے۔ وکٹ بیٹسمین کے لئے کافی اچھی تھی لہٰذا ان دونوں کھلاڑیوں نے خوب جم کر کھیلنا شروع کیا اور رنز پہ رنز بنانے لگے۔ شیپرڈ ۳۷ رنز بنا کر انگلستان کے کُل اسکور کو ۹۰ تک پہنچا چکا تو خان محمد کی گیند نے اسے مزید کھیلنے سے روک دیا۔ شیپرڈ کی جگہ بیڈر مے آیا لیکن خان محمد نے اُسے جوہر دکھانے کا کوئی موقع نہ دیا اور اپنے پہلے ہی اوور میں اس کو پسپا

کر دیا۔ مے کے بعد کامپٹن نے گراؤنڈ کا رُخ کیا اور چونکہ شام کا وقت قریب آ رہا تھا اور کھیل ختم ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ باقی تھے اس لئے اس نے سمپسن کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ کھیلنا شروع کیا۔

اس وقت کامپٹن کے سامنے میں تھا۔ اور شمالی جانب کھڑا اسی کنارے سے گیند اندازی کر رہا تھا جہاں ٹیم انگلستان کا باؤلر سٹیتھم کھڑا گیند پھینک رہا تھا۔ سٹیتھم نے اپنے کھیل کے دوران میں گیند پھینک پھینک کر باؤلنگ کریز پر گڑھا سا بنا ڈالا تھا۔ میں چونکہ کامپٹن کو آؤٹ کرنے پر تُلا ہوا تھا لہٰذا میں نے زیادہ شدت سے باؤلنگ شروع کر دی مگر میرا پاؤں بار بار اس گڑھے میں پڑتا اور مجھے تکلیف محسوس ہوتی۔ کامپٹن بڑی ہوشیاری سے کھیل رہا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے میری گیندوں کو ناکام بنانے میں خاصی دِقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مجھے اس وقت یقین ہو چلا تھا کہ میں اُسے آؤٹ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے کمیٔ وقت کے پیش نظر اور شدت اختیار

کرلی۔میں اپنے آخری اوور کی پانچویں گیند پھینکنے کے لئے تیزی
سے بڑھا کہ میرا بایاں پاؤں اسی گڑھے میں گرا اور جسم کا سارا بوجھ
ٹانگ پر پڑنے کے باعث میری بائیں ران کا مسل اندر سے
پھٹ گیا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگ میں
یکایک برقی رو گذار دی گئی ہو۔ میں نے اسی حالت میں اوور
کا آخری گیند پھینکا تو میرے لئے ایک قدم چلنا بھی محال ہو رہا تھا
بہرحال وقت ختم ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں ہوٹل پہنچا اور خود
ہی ایمبروکیشن کے ساتھ تمام جسم کی مالش کی اور گرم پانی سے غسل
کر کے گرم گرم بستر میں دبک گیا۔ تاکہ شب بھر کے آرام سے اگلی
صبح تک ٹھیک ہو جاؤں۔ رات کے بارہ بجے تک ہزار کوشش
کے باوجود درد کے مارے نیند نہ آئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو میرا ہاتھ
سب سے پہلے اپنی ران پر گیا اور میں نے محسوس کیا کہ ٹانگ
کی حالت جوں کی توں ہے ——— چاروناچار اسی طرح گراؤنڈ
پہنچا اور ایک مالش کرنے والے اور ایک ڈاکٹر سے مشورہ کرنے
کے بعد مالش کرا کے پٹی بندھائی اور اوپر دو (Knee Caps)

ٹی کیپس، پڑھالیں۔ پٹی : نی کیپس، اور مسل کی خرابی کے باعث ٹانگ بالکل ناکارہ ہو چکی تھی اور میں کھیلنے سے معذور تھا۔ میں نے کاردار سے کہا کہ میری حالت ناگفتہ بہ ہے اور میرے لئے باؤلنگ کرنی ممکن نہیں لیکن انہوں نے مشورہ دیا کہ میں فیلڈ پر جا کر آزماؤ دیکھو شاید تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہو جائے۔ کاردار کے کہنے پر میں فیلڈ میں پہنچا تو باؤلنگ کریز پر کھڑے پہلا اوور پھینکا کیونکہ میں دوڑنے کے قابل نہیں تھا۔ نتیجے کے طور پر میری گیند کی رفتار بمشکل چوتھائی رہ گئی۔ البتہ گیند ٹھیک فاصلے پر پھینکنے میں ضرور کامیاب ہو گیا۔ پہلا اوور ختم ہونے پر میں نے پھر کاردار کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں فقط کھڑے کھڑے گیند پھینک سکتا ہوں اور اپنے خاص اسٹائل سے باؤلنگ نہیں کرسکتا۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اجازت دے دیں۔ کاردار نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی اور میں نے اسی طریقے سے باؤلنگ شروع کردی۔ سامنے کامپٹن اور سمپسن کھڑے تھے اور خوب جم کر کھیل رہے تھے۔ جس وقت کامپٹن کا اسکور ۲۰ تھا تو میری گیند

پر امتیاز کی طرف کیچ گیا لیکن افسوس کہ اس نے یہ پہلا اور آخری کیچ کھو دیا۔ اب کامپٹن کھیلنے میں ذرّہ برابر وقت محسوس نہیں کر رہا تھا اور بڑھ بڑھ کر ہٹ لگانے میں مشغول تھا۔ سمپسن بھی کامپٹن کی پیروی میں پاکستان ٹیم کو زیادہ سے زیادہ زچ کرنے میں پیش پیش تھا۔ اور ان دونوں کھلاڑیوں کے اشتراک سے ہماری ٹیم کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی چلی گئی۔ اسی اثنا میں لنچ کا وقفہ آیا اور دوپہر کے کھانے کے بعد بھی سمپسن اور کامپٹن میدان میں حاضر و ناظر موجود بقول شخصے ہماری جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف تھے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا جب خالد حسن کی ایک گیند سمپسن کو وکٹ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئی اور وہ "صرف" ۱۰۱ رنز بنانے کے بعد پویلین کو چل دیا۔ ابھی ہم نے بمشکل اس بلا سے نجات پائی تھی کہ اس کا خلا پُر کرنے کے لئے گریونی آیا اور آتے ہی مار دھاڑ کا بازار گرم کر دیا اور اپنی اننگز میں ۴۸ رنز بنا کر کاردار کے ہاتھوں آؤٹ ہو گیا۔ اگرچہ گریونی کا اسکور کامپٹن کے مقابلے پر کچھ بھی نہ تھا جس نے خالد حسن سے شکست

کھانے سے پہلے ۷۰ رنز بنائیں۔ اور انگلستان کے کل اسکور میں قابلِ قدر اضافہ کیا لیکن جب لاثانی کھیل کی نمائش گریونی نے کی وہ کچھ اسی کا حصہ تھا اور بعد میں مَیں نے ویسی اننگز انگلستان کے پورے دورے میں کسی بیٹسمین کو کھیلتے نہیں دیکھا۔ اس نے اپنی ۸۴ رنز میں کرکٹ کے تمام شاٹ کھیلے اور کرکٹ کا وہ نمونہ پیش کیا جس سے مزید بہتر شاید ممکن نہیں۔ اس کے برعکس گو کا میپٹن نے ۷۰ رنز بنائیں اور کافی اچھے کھیل کی نمائش کی لیکن فنی اعتبار سے اس کا کھیل گریونی کے پائے کا نہ تھا۔

گریونی کے آؤٹ ہونے پر بیلے برآمد ہوا اور کا میپٹن کے گراؤنڈ چھوڑنے پر ایونز نے اس کی جگہ سنبھالی۔ بیلے تو اننگز کے اختتام تک ناٹ آؤٹ رہا لیکن ایونز کو خان محمدؐ نے فقط چار رنز بنانے کی فرصت دی اور اسے جلد ہی ٹھکانے لگادیا۔ کھیل سارا دن اسی زور شور سے جاری رہا اور جب شام کا وقت قریب آگیا اور کھیل ختم ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو شیپرڈ نے اپنے کھیل کے اختتام کا اعلان کردیا۔ اس وقت انگلستان کا

اسکور ۸۰۵ ۵ تھا اور اس کے چھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ میں نے اس دوران میں ۴۷ اوور پھینکے جس کی وجہ سے میری ٹانگ اس حد تک خراب ہو گئی کہ مجھے چلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا

انگلستان کے بعد پاکستان نے اپنی دوسری اننگز کا آغاز بھی حنیف اور علیم الدین کی بیٹنگ سے کیا۔ حنیف محمد نے اس آخری گھنٹے میں عظیم الشان کھیل کا مظاہرہ کیا اور انگریز باؤلرز کو بری طرح پیٹا۔ اس نے بیڈسر ایسے گیند انداز کو ایک اوور میں تین چوکے لگا دکھائے اور اس کی خوب اچھی طرح خبر لی۔ ہمارے یہ دونوں کھلاڑی کھیل کے اختتام تک ناٹ آؤٹ رہے۔ حنیف نے اس عرصے میں ۴۷ رنز بنائیں مگر علیم کو سٹیدھم نے چار سے زائد رنز بنانے کا موقع نہ دیا۔

شام کو جب ہم ہوٹل کو لوٹے تو ہمیں اپنی شکست یقینی نظر آرہی تھی۔ ابھی ہم دل ہی دل میں اس حادثے پر اچھی طرح افسوس بھی نہ کر چکے تھے کہ رات کو بارش ہونی شروع ہو گئی۔ صبح اٹھے تو مینہ بند ہو چکا تھا۔ وقت مقررہ پر گراؤنڈ پہنچے اور وکٹ پر نگاہ ڈالی تو وہ مکمل

طور پر باؤلرز کی طرف دار نظر آئی۔ بہر حال حنیف اور علیم نے دوبارہ کھیل شروع کیا اور حنیف نے پندرہ بیس منٹ میں اپنی نصف سینچری مکمل کر لی لیکن اس سے قبل کہ ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوتے آسمان سے بوندا باندی شروع ہو گئی اور سب کھلاڑی بھاگ کر پویلین میں پناہ گزیں ہوئے۔ بارش تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی اور پھر تھم گئی۔ چنانچہ کھیل از سرِ نو شروع ہوا مگر شومیِ قسمت سے بیڈسر کی دوسری ہی گیند نے حنیف کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ ۵۱ رنز کے عوض اپنی جگہ خالی کر آیا۔ حنیف کے بعد وقار کو بھیجا اور وہ بھی سات رنز کا اثاثہ لیے سٹیدھم کو دعائیں دیتا واپس چلا آیا۔ وقار کی جگہ مقصود نے سنبھالی اور ہماری کچھ ڈھارس بندھی کیونکہ اس نے خوب جم کر کھیلنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ حنیف اور وقار کے صدمے سے پیدا شدہ زخم مندمل ہونے لگے لیکن ابھی یہ زخم پوری طرح بھرنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک اور چوٹ پڑی یعنی علیم الدین کو بھی ۸ رنز کے عوض بیٹ سے ہاتھ دھونا پڑے اور وہ بھی سٹیدھم کے فن پر سوچ بچار کرتا پویلین

کی طرف چل پڑا۔ علیم کی جگہ امتیاز کو بھیجا گیا اور اس نے مقصود کے ساتھ مل کر دلجمعی سے کھیلنا شروع کیا۔ مقصود احمد نے بہترین کرکٹ کھیلی اور اپنا اسکور ۶۳ تک لے گیا۔ ان دونوں کھلاڑیوں کو دیکھ کر ایک موہوم سا خیال ذہن میں آیا کہ شاید میچ کا نقشہ بدل ہی جائے لیکن افسوس کہ مقصود کی لاپروائی نے اس خیال کو حقیقت میں تبدیل نہ ہونے دیا۔ اس وقت حالات کا تقاضا تھا کہ وہ پوری ذمّے داری اور سنجیدگی کے ساتھ سنبھل کر کھیلتا لیکن اس نے انجام سے بے نیاز ہو کر بغیر سوچے سمجھے ہٹ لگانی شروع کر دیں اور نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع تھی یاپل یارڈ نے اسے گیند پھینکی اور اس نے فوراً ہٹ لگا دی۔ گیند فضا میں تیرتی ہوئی سیدھی سٹیڈیم کے پاس پہنچی لیکن حسن اتفاق سے اس نے کیچ کھو دیا۔ اگر مقصود اب بھی سمجھ جاتا تو خیریت گذر جاتی مگر اُس نے اپل یارڈ کی گیند کو پھر بُری طرح پیٹا اور اب کے گیند ہوا میں تیرتی پیرے کے دستِ مبارک میں تھی جو باؤنڈری لائن پر کھڑا فیلڈ کر رہا تھا۔ قریب تھا کہ مقصود بیٹ ہاتھوں میں اٹھا کر گراؤنڈ کو الوداع کہہ دیتا

کہ انگریزہ کی مسلّمہ دیانت داری نے اسے پھر ایک موقع دے دیا۔ پیٹر مے نے گیند کیچ کر کے باونڈری لائن کی طرف دیکھا تو اس کے پاؤں کی ایڑی لائن سے باہر تھی۔ اس نے ایک دم "اوور باؤنڈری" کا اشارہ دیا اور مقصود اس بار بھی بال بال بچ گیا۔ مقصود کا اس ڈرامائی انداز میں بچاؤ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ اپنی غلطی کا جیتا جاگتا ثبوت اس کے سامنے تھا وہ ذرا بھی دانشمندی سے کام لیتا تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا لیکن مقصود کی لاابالیانہ طبع نے اس کی فکر پر غلبہ پا لیا اور اس نے تیسری دفعہ پھر ویسی ہی ہٹ لگائی۔ ردِ عمل کے طور پر گیند فضا کو چیرتی ہوئی ایک بار پھر سٹیتھم کی طرف گئی جس نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے گیند قابو کر لی اور مقصود ۶۹ رنز کے بدلے میدان کو خیرباد کہہ آیا۔

مقصود کی جگہ کاردار گئے اور جاتے ہی چار رنز بنا لیں۔ ابتدا کافی حوصلہ افزا تھی لیکن وارڈل بھی کوئی بچہ نہ تھا۔ اس نے پانچ مرتبہ تو صبر کر لیا۔ مگر چھٹی گیند پھینک کر پہلے اوور کے اختتام کے ساتھ

ہی کاردار کی بیٹنگ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ کاردار کے بعد میری باری تھی۔ میں چلنے کو تو چل پڑا لیکن عالم یہ تھا کہ پاؤں زمین سے اُٹھتا نہ تھا۔ میں نے کاردار سے اپنی بجائے دوڑنے کی درخواست کی لہٰذا وہ میرے ساتھ ہو لیئے۔ اس وقت کھیل ختم ہونے میں تقریباً نصف گھنٹہ باقی تھا۔ گراؤنڈ میں پہنچ کر وکٹ پر نگاہ ڈالی وکٹ قدرے خراب ہو چکی تھی اور بدستور باؤلرز کی اعانت کا دم بھر رہی تھی۔ گیند جب وکٹ سے ٹکراتی تو نئے نئے انداز سے اوپر کو اُٹھتی اور بیٹسمین کی مصیبت میں ہر ممکن اضافہ کرتی۔ میرے لئے ایک عذاب یہ تھا کہ میں گیند کو زوردار ہٹ لگانے سے معذور تھا کیونکہ حرکت سے ٹانگ کا درد ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جاتا۔

بہرحال میں کسی نہ کسی طرح امتیاز کے ساتھ مل کر کھیلتا رہا۔ ہمارے مدِمقابل وارڈل، اور ایپل یارڈ تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہم دونوں شام تک ٹکے رہیں گے لیکن وارڈل نے کھیل ختم ہونے سے پانچ منٹ قبل امتیاز کو ایل۔ بی۔ ڈبلیو کا نشانہ بنا دیا اور وہ ۳۲ رنز بنا کر آؤٹ ہو گیا۔ امتیاز کا خلا غزالی سے پُر کیا گیا۔ ہم دونوں نے آہستہ آہستہ

کھیل کر پانچ منٹ گذار دیئے اور کھیل کے اختتام تک ناٹ آؤٹ رہے۔

۴ تاریخ کو بدھ اتوار کھیل بند رہا۔ ۵ تاریخ کی صبح کو میں اور غزالی پھر اپنی اپنی سائڈ پر کھڑے ہو گئے۔ میں اس مرتبہ امتیاز کو بطور رنر اپنے ہمراہ لے گیا اور ہولے ہولے کھیلنا شروع کیا۔ انگلستان کی طرف سے بیڈسر اور سٹیدھم باؤلنگ کرنے بھیجے گئے۔ بیڈسر نے غزالی کو صرف ۱۴ رنز بنانے کی مہلت دی اور غزالی آؤٹ ہو گیا۔ غزالی کو ناکام بنانے میں سٹیدھم بھی برابر کا حصہ دار تھا جس نے غزالی کی مضروبہ گیند کیچ کی۔ میرے سامنے سٹیدھم باؤلنگ کر رہا تھا کہ شیپرڈ نے اسے تبدیل کر کے ایپل یارڈ اور وارڈل کو آزمایا اور پھر سٹیدھم کو بھیج دیا۔ میں نے اس تکلیف کی حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح ۲۶ رنز بنا ڈالیں، اور بالآخر سٹیدھم نے مجھے بھی آرام گاہ میں بھیج دیا۔ اب ہمارے پاس آخری مہرے اسلم اور خان محمد رہ گئے تھے لہٰذا ان کو انجام کی نشان دہی کے لئے میدانِ کارزار میں بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنی سی ہر سعی کی لیکن ایپل یارڈ اور وارڈل کے سامنے

ان کی ایک نہ چلی اور یہ دونوں کھلاڑی بالترتیب ۱۰ اور ۸ رنز کا سرمایہ لے کر واپس پویلین میں چلے آئے اور ہماری ساری ٹیم کل ۲۷۲ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ انگلستان نے یہ میچ ایک اننگز اور ۱۲۹ رنز کی اکثریت سے جیت لیا اور پاکستان ٹیم کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

"پریس کا کیا ردِ عمل تھا؟" میں نے دریافت کیا۔ "صرف اتنا کہ پاکستان کی ٹیم بہت کمزور ہے اور اسے فی الحال "ٹسٹ سٹیٹس" نہیں دینا چاہیئے تھا۔" اور میں شب بخیر کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

۲۹ کی شام کو میں نہ جا سکا اور تیس کی شام وائی ایم سی اے والوں نے غارت کر دی جنہوں نے فضل کو دورہ انگلستان پر انگریزی میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کر لیا چنانچہ ہم فردوس نگر سے ٹانگے میں بیٹھ کر مال روڈ کو ہو لئے۔ نصف راستہ میں اُسے وقت برباد نہ کرنے کی تلقین کرتا رہا اور ریگل کو عبور کر کے اس نے تقریر کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے بارہا سگرٹ سلگائے

اور بھٹکے مگر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ ہم پھر کسی اور موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہاں پہنچ کر کیا کہا جائے کہ ٹانگہ رُک گیا۔ اور ہم نے دائیں طرف نگاہ اُٹھائی تو وائی ایم۔ سی۔ اے کی سرخ بلڈنگ سامنے تھی "اب کیا بنے گا؟" میں نے ٹانگے سے اُترتے ہوئے دانستہ مایوسانہ لہجے میں پوچھا۔ "کچھ نہ کچھ تو بنے گا ہی"۔ فضل نے سڑک پار کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ چند ثانیے بعد ہم ہال میں تھے۔ حاضرین نے فضل کی آمد پر خوشی کے مارے بے تحاشا تالیاں بجائیں اور وہ سب کا تشکریہ ادا کرتے ہوئے اسٹیج پر جا بیٹھا جہاں قائمقام صدر فضل دین جوشوا نے فضل کو ہار پہنائے۔ استقبالیہ ہنگامہ ختم ہوا تو جوشوا اُٹھے اور ایک مختصر سی تقریر میں فضل کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بعد کہا کہ ہم سب بلاشبہ خوش قسمت ہیں جنہیں اوول کی کہانی اوول ہیرو کی زبانی سننے کا موقعہ ملا ہے ___ میں اس اثنا میں ہال کا جائزہ لیتا رہا۔ مردوں کے علاوہ بچے اور خواتین بھی آئیں تھیں۔ دائیں قطار کی سب سے اگلی نشست پر بیگم فضل محمود،

ان کے چند عزیز اور ایک نوجوان امریکی خاتون تشریف فرما تھیں ان سے پچھلی قطار میں بھی چند بیگمات براجمان تھیں۔ باقی سب بنچ انواع و اقسام کے مردوں اور طالبعلموں سے بھرے پڑے تھے۔

جوشوا اپنی "صدارتی خطبہ نما تقریر ختم کر چکے تو فضل صاحب اُٹھے اور آتے ہی نعرہ لگایا" لیڈیز اینڈ جنٹلمین" اور میں دل ہی دل میں خوش ہونے لگا کہ آج شہزادہ صاحب کی ضرور گت بنے گی۔ غیر زبان میں بغیر ایک منٹ کی تیاری کے گھنٹہ بھر متواتر لکچر دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ رہ رہ کر میرے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ جس طرح روز میرے دل کو جلایا جاتا ہے اسی طرح آج ان کا کلیجہ بھی حاضرین کی ہوٹنگ سے چھد جائے گا۔ چنانچہ میں نے کچھ مزید غور سے تقریر سننا شروع کر دی تاکہ بعد میں غلطیاں نکال کر فضل کو روحانی کوفت پہنچاؤں۔ پانچ منٹ، —— دس منٹ —— پندرہ منٹ —— میں نے بہتیرا انتظار کیا لیکن خلافِ توقع لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے گئے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً زوردار تالیوں اور

ہلکے ہلکے قہقہوں کی صورت میں داد تحسین بھی دیتے گئے۔ میں جز بز
تو بہت ہوا لیکن دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ میں پورا
ایک گھنٹہ اس لمحے کا منتظر رہا مگر وہ وقت نہ آنا تھا نہ آیا اور فضل
پیاری پیاری انگریزی میں مزے مزے تقریر کرتا چلا گیا اور لوگوں
کی توجہ لحظے بھر کے لئے بھی کسی اور طرف مبذول نہ ہونے دی۔
میری آرزو تشنۂ تکمیل ہی رہ گئی اور مجھے چار و ناچار تسلیم کرنا ہی
پڑا کہ وہ بہترین کھلاڑی ہی نہیں ایک اعلیٰ درجے کا مقرر بھی
ہے۔ خدا خدا کر کے لیکچر ختم ہوا تو لوگوں نے مختلف زبانوں میں
سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ کوئی صاحب السنۂ شرقیہ کی گردن زنی
کرتے نظر آئے تو کوئی حضرت انگریزی کی ٹانگ توڑنے پر کمربستہ
ہو گئے۔ ایک ذاتِ شریف نے تو حد کر دی اور کئی زبانوں کے
اشتراک سے ایک ایسا ملغوبا تیار کیا کہ حاضرین ہنس ہنس کر لوٹ
پوٹ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت بیک وقت گیانی،
ادیب، عالم اور ایف۔ اے اِن انگلش کے امتحانات کی تیاری
میں مشغول ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں طالبعلم ہونے

کا بیّن ثبوت تھیں۔ بہرحال یہ مرحلہ بھی گذر گیا تو آٹوگراف کے شائقین نے اسے اسٹیج پر ہی جا دبوچا اور اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ میں گیلری پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور بار بار گھڑی کی جانب نگاہ جاتی تھی۔ بارے وہ ان کے نرغے سے نکلا اور سیڑھیوں کو الانگتا پھلانگتا بمشکل گیٹ پر پہنچا۔ گیٹ پر پھر ہجوم نے اسے جا لیا اور وہ بغیر سوچے سمجھے کسی شریف آدمی کی کار میں بیٹھ گیا جو اسے لے کر زن سے نکل گئے۔

میرا خیال تھا کہ وہ اگلے چوک میں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ لہذا میں ہر طرف دیکھتا گیا لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ مجھے سخت کوفت ہوئی اور میں ٹانگہ پکڑ کر شیراز جا پہنچا۔ پتہ چلا کہ ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہیں اور یہ سُن کر میری مٹھیاں بھنچنے لگیں۔ اسی وقت سگرٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا گھر پہنچا۔ بیگم فضل اکیلی بیٹھی تھیں۔ میں نے جلدی سے ایک رقعہ لکھا جس میں خوب جلی کٹی سنائیں اور بھابھی کے حوالے کر دیا۔

"آج نشست نہیں ہو گی کیا" بھابی نے مجھے اُلٹے پاؤں رخصت ہوتے دیکھ کر کہا۔ "مجھے آج ضروری کام ہے اس لئے معذور ہوں۔"

میں نے بڑے تحمّل سے جواب دیا۔ اور رُوٹھ کر گھر چلا آیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ کل آکر اب خود منائے گا ــــ ساری رات مُوڈ سخت خراب رہا۔ صُبح اُٹھا تو کوئی گیارہ بجے کے قریب ٹیلیفون آیا "معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے آج" فضل نے چھوٹتے ہی کہا اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا خوب تیز رفتاری سے بولنا شروع کر دیا اور سارا الزام میرے سر تھوپ دیا: "رات کو میں بہترین گاڑی لے کے حضور کے دولت پر پہنچا۔ لیکن آپ کے ہمسائے جاگ اُٹھے آپ نہیں جاگے" وہ نمبروار الزامات کی فہرست بیان کر رہا تھا۔ "صبح پھر حاضر خدمت ہوا اور مکتبہ دارالبلاغ بھی گیا مگر آپ کا کوئی سراغ نہ ملا ــــ وہاں سے چلا اور تمام راستہ آپ کو دیکھتا رہا۔ آپ کی صورت کہیں نظر نہ آئی" "پھر" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا "پھر اب میں آؤں یا آپ شام کو آرہے ہیں ــــ میں اترسوں کیمپ کے لئے بہاول پور جا رہا ہوں ــــ" آخری جملہ سننے کے بعد میں نے اُسے پھر شام کو گھر رہنے کا مشورہ دیا۔ اور یکم دسمبر کی شام کو

وہ حسبِ معمول اپنے ڈرائنگ روم میں صوفے پر دراز سگرٹ کے
کش پر کش لگاتا عہدِ گم گشتہ کی یادوں کو حیاتِ جاوید بخش رہا
تھا ——" دوسرا انٹسٹ میچ ختم ہوا تو سید فدا حسن اور کارڈار
ڈینیٹ برج گراؤنڈ کی پویلین میں آئے اور مجھے بتایا کہ انہوں
نے ایلیف گوور سے مشورہ کر کے مجھے برائے علاج لندن بھیجنے
کا انتظام کر لیا ہے اور ایلیف گوور مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر
لندن لے جائیں گے جہاں مسلز اور ہڈی کے ماہر ڈاکٹر ٹکر سے
طبّی مشورہ لیا جائے گا۔ ابھی ہم باہم گفتگو کر رہے تھے کہ اتنے
میں ایلیف گوور بھی تشریف لے آئے اور مجھے جلد از جلد تیار
ہونے کی ہدایت کی کیونکہ ہمیں ۵۰ امیل کا سفر طے کرنا تھا۔
میں یہ سنتے ہی لنگڑاتا ہوا اُن کے ساتھ ہو لیا اور ہم گاڑی میں
بیٹھ کر سامان وغیرہ لینے کے لئے سیدھے ہوٹل پہنچے اور چند ایک
ضروری اشیا لے کر نوٹنگھم سے لندن روانہ ہو گئے۔

گاڑی فرّاٹے بھرتی چلی جا رہی تھی اور میں ایلیف گوور کے
ساتھ باتوں میں مشغول سگرٹ نوشی کا لطف بھی اٹھا رہا تھا۔

دورانِ سفر مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی کیونکہ درد صرف چلنے سے ہوتا تھا اور چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ ہمیں سفر کرتے پانچ چھ گھنٹے گزر چکے تو ہم لندن کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت شام کے ساڑھے سات بجے ہوں گے۔ میں نے رہائش کے لئے "شیپرڈ ہوٹل" پٹنی کا انتخاب کیا جہاں میں گذشتہ سال پاکستان انگلینڈ کے ہمراہ قیام پذیر تھا۔ مزید برآں میاں سعید بھی وہیں مقیم تھے۔ چنانچہ ہم اسی ہوٹل میں گئے۔ لینڈ لیڈی پہلے سے ہی متعارف تھی لہذا جگہ ملنے میں کوئی دِقّت پیش نہ آئی اور اس نے فوراً ایک کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔ ایف۔ گوور مجھے اگلے روز دوپہر کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے اور میں اپنے کمرہ میں چلا گیا ـــــ دوسرے دن ایف گوور دوپہر کو ڈیڑھ بجے کے قریب تشریف لائے اور ہم دونوں ڈاکٹر ٹکر کے مطب جا پہنچے۔ ڈاکٹر ٹکر چونکہ بذاتِ خود بین الاقوامی رگبی فٹ بال پلیئر (International Rugby Foot Ball Player)

رہ چکے ہیں۔ اس لئے وہ مسلز کی خرابی کے اسباب و علل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میں نے انہیں ساری کیفیت سنائی اور کوئی پندرہ منٹ بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ مجھے اسٹریچر پہ لٹا کر میری بائیں ران پہ مسلز کے عین اُوپر تین ٹیکے لگائے گئے اور مسلز کو مختلف برقی آلات سے چھو کر مالش کر دی گئی ڈاکٹر نے ران کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد مجھے ایک ہفتہ زیرِ علاج رہنے کی ہدایت کی اور ہم واپس چلے آئے۔

ہفتہ بھر کے بعد میرے مسلز کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گئی اور میں نے ڈاکٹر کی اجازت سے شام کو ایلف گوور کے اسکول میں جا کر نصف گھنٹہ کے قریب کرکٹ پریکٹس کرنی شروع کر دی تاکہ مسلز میں رفتہ رفتہ پھر سے قوّتِ برداشت پیدا ہو جائے۔ ابتدائی علاج کے دوران میں میری حالت ۸۰ فیصد بہتر ہو چکی تھی۔ اور چند دنوں کے بعد میں صرف مالش کرانے جاتا تھا۔ دس پندرہ روز گزر چکے تو میری ٹانگ کی حالت معمول پر آ گئی اور میں اچھی طرح چلنے پھرنے کے علاوہ تیزی سے دوڑنے کے قابل بھی ہو گیا

چنانچہ میں نے ڈاکٹر کا علاج بند کر دیا۔

اس دوران میں پاکستان کرکٹ ٹیم ڈربی شائر، لنکا شائر اور نارتھ ایمپٹن شائر کے ساتھ میچ کھیل کر ۱۶ جولائی کی رات کو لندن پہنچی اور میں بھی "شیئرروڈ" ہوٹل چھوڑ کر اپنی ٹیم کے ساتھ "برنز ہوٹل" میں سکونت پذیر ہو گیا۔ ۱۷، ۱۹ اور ۲۰ کو ہماری ٹیم سرے کاؤنٹی کے ساتھ نبرد آزما رہی اور میچ برابر ہو گیا۔ اگرچہ میں اس میچ میں شامل نہ ہوا لیکن میں روزانہ میچ شروع ہونے سے پیشتر اوول گراؤنڈ کے نیٹس میں پریکٹیس کرتا رہا اور گو میرے مسلز اب بالکل ٹھیک ہو چکے تھے پھر بھی دل میں ایک کھٹکا ضرور تھا کہ کہیں تیسرے ٹسٹ میچ میں میری ٹانگ مجھے دغا نہ دے جائے۔ سرے کاؤنٹی سے عہدہ برآ ہو کر ہماری ٹیم مورخہ ۲۰ جولائی کو بذریعہ گاڑی علی الصبح لندن سے مانچسٹر روانہ ہو گئی۔ کھلاڑیوں کے حوصلے بلند اور چہرے بشاش نظر آ رہے تھے اور نوٹنگھم کی شکست کے اثرات کافی حد تک زائل ہو چکے تھے۔ کیونکہ نوٹنگھم میں کھیلے ہوئے دوسرے ٹسٹ میچ کے بعد پاکستان ٹیم کو کہیں بھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ ڈربی شائر،

نارتھ ایمپٹن شائر اور ہمرے سے برابر رہنے کے ساتھ ساتھ لنکاشائر کا میچ ۱۰ وکٹوں سے جیت لیا گیا لہٰذا پاکستان ٹیم کا پلّہ پھر بھاری تھا۔ ہماری انتخابی کمیٹی نے دورانِ سفر ہی تیسرے ٹسٹ میچ کے لیے ٹیم تشکیل دی جس میں میرے علاوہ کاردار، مقصود، امتیاز، حنیف، وقار، غزالی، خالد وزیر، شجاع، محمود حسین اور وزیر محمد شرکت کر رہے تھے۔ آخرالذکر تین کھلاڑیوں نے مذکورہ چار کاؤنٹی میچوں میں اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا جس کی بنا پر انہیں ٹسٹ ٹیم میں شمولیت کا موقع دیا گیا۔ اس ٹسٹ ٹیم میں ہمارے دو بہترین کھلاڑی علیل ہونے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ علیم الدین پہلے ہی کھیل کے ناقابل تھا اور پر سے خان محمدؐ نے بھی بذریعہ تار اطلاع دی کہ میں کمر کے مسلز کی خرابی کے باعث کھیلنے سے معذور ہوں۔

مانچسٹر پہنچے تو میں نے رات کو سونے سے پہلے ایمبر وکیشن سے سارے جسم کی مالش کی تاکہ میرے جملہ اعصاب کھیل کے دوران میں میرا پورا پورا ساتھ دیں۔ دوسرے دن صبح ہم نے ٹیکسیوں میں بیٹھ کر "اولڈ ٹرافرڈ" گراؤنڈ کا رخ کر لیا۔ اس وقت سخت تیز اور

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مطلع حسبِ معمول ابر آلود تھا اور مانچسٹر کی روایت کے مطابق بارش ہونے کا گمان غالب نظر آتا تھا۔ کیونکہ مانچسٹر انگلستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں موسم گرما میں روزانہ بارش ہونی تقریباً لازمی ہے اور اس وجہ سے اولڈ ٹرافرڈ گراؤنڈ کی تاریخ میں بہت کم ٹسٹ میچ ہوں گے جن کی ہار جیت کا تصفیہ ہو سکا ہو ورنہ یہاں جتنے بھی ٹسٹ کھیلے گئے بارش کی مداخلت نے انہیں تشنۂ تکمیل ہی رہنے دیا۔ ہم موسم کا نظارہ اور دل میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے اولڈ ٹرافرڈ کے میدان میں جا پہنچے۔ تماشائیوں کی تعداد چھ سات ہزار کے قریب تھی کھیل شروع کرنے سے پہلے کاردار اور شیپرڈ ٹاس کرنے کے لئے گراؤنڈ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نتیجہ شیپرڈ کی حمایت میں برآمد ہوا اور اس نے بیٹنگ کو ترجیح دی۔

انگلستان کی طرف سے قائم مقام کپتان شیپرڈ کے ساتھ پیٹر مے، بیلے، کامپٹن، بیڈسر، وارڈل، ایونز، گریونی، سٹیدھم، مکانن اور پارکس حصّہ لے رہے تھے اور ساری ٹیم میں فقط آخرالذکر

دو کھلاڑی پہلی مرتبہ ٹسٹ میں شریک ہو رہے تھے۔ بہر حال انگلستانی بیٹنگ کا آغاز کرنے کے لئے کپتان شیپرڈ بذاتِ خود اور بیلے دونوں کناروں پر آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ پاکستان کی طرف سے میں اور محمود حسین باؤلنگ کے لئے میدان میں گئے اور میں نے کاردار کی ہدایت کے بموجب شیپرڈ کو پہلا اوور پھینکنا شروع کر دیا پہلی گیند پھینکنے کے بعد مجھے اپنے مسلز کے متعلق تسلّی ہو گئی اور وکٹ کے بارے میں بھی میرا اندازہ تھا کہ وکٹ گیند کو "سپن" کرنے میں بھی ہر ممکن سہولت بہم پہنچائے گی۔ چنانچہ میں نے نہایت اطمینان سے بقیہ پانچ گیندیں پھینکیں لیکن میرے اوور کے اختتام کے ساتھ ہی بارش کا آغاز ہو گیا اور سب کھلاڑی بھاگ کر آرام گاہ میں چلے گئے۔ بارش تقریباً پندرہ منٹ جاری رہی اور ہم پھر گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ اس مرتبہ محمود حسین نے بیلے کو کھلانا شروع کیا اور اس کا پہلا اوور میڈن رہا۔ اسی طرح میں نے دوسرا اوور پھینکا مگر کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ البتہ تیسرے اوور کی پہلی ہی گیند پہ شیپرڈ کی وکٹوں کو تیزی سے

پھلانگتی وکٹ کیپر امتیاز کے پاس پہنچی اور میرے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی "آؤٹ" مگر افسوس کہ گیند وکٹ کو نہ چھو سکی اور وار خالی گیا۔ یہی حشر میری تیسری گیند کا ہوا اور میری "آؤٹ" کی آواز پھر رائیگاں گئی۔ شیپرڈ اپنے اسکور میں آہستہ آہستہ اضافہ کیے چلا جا رہا تھا۔ جب وہ ۱۳ رنز بنا کر انگلستان کا کل اسکور ۲۰ تک پہنچا چکا تو میری گیند شیپرڈ کے پاؤں کو چومتی ہوئی سیدھی اُس کی وکٹ کو جا لگی اور شیپرڈ بیٹ سنبھال میدان سے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی جگہ پیٹر مے آکھڑا ہوا اور محمود حسین نے اُسے کھلانا شروع کر دیا۔

محمود حسین پانچ اوور پھینک چکا تو اسے تبدیل کر کے شجاع کو موقع دیا گیا۔ پیٹر مے کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ تیز رفتاری سے رنز بنائے مگر ہماری بولنگ اور پہلے سے نسبتاً بہتر فیلڈنگ نے اس کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ شجاع اس وقت نہایت اچھی بولنگ کر رہا تھا۔ چنانچہ پیٹر مے چودہ رنز بنا چکا تو شجاع نے اُسے ایک بہترین گیند پھینکی۔ مے نے سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق گیند

کو کٹ کیا تاکہ وہ جلد از جلد رنز بنائے لیکن اس کی قسمت کہ گیند بیٹ سے ٹکرا کر امتیاز احمد کے ہاتھ میں چلی گئی اور وہ کیچ آؤٹ ہو گیا۔

بیلے ابھی تک کھیل رہا تھا لیکن اس کی مردہ بیٹنگ دلچسپی سے یکسر عاری تھی وہ صرف دفاعی انداز میں کھیل رہا تھا اور تماشائیوں کو شاذ و نادر ہی اس کی ہٹ سے محظوظ ہونے کا موقع ملتا پیٹر مے میدان سے رخصت ہو چکا تو کاپٹن نمودار ہوا اور بیلے کے اشتراک میں خوب سنبھل کر کھیلنا شروع کیا۔ ہماری طرف سے شجاع اور محمود حسین امتحان گاہ میں کھڑے تھے اور اپنے فن کا قابلِ قدر نمونہ پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ بیلے جب ۴۲ رنز بنا چکا تو "رن آؤٹ" ہو گیا۔ بیلے کی جگہ ٹام گریونی سے پُر کی گئی اور اس نے کاپٹن کے ساتھ مل کر کافی اچھی کرکٹ کا مظاہرہ کیا۔ کاپٹن بھی بڑی عمدگی سے کھیل رہا تھا۔ لیکن پاکستان باؤلرز کی فنی چابکدستی نے ان دونوں کو زوردار بیٹنگ سے محروم رکھا۔ کاپٹن شائد خود بھی کھیل کی سست روی سے بور ہو رہا تھا چنانچہ اس نے ۳۰ رنز بنانے کے بعد شدت اختیار کر لی اور شجاع الدین کی باؤلنگ کو بیکار کرنے

کی ہر ممکن سعی کرنے لگا۔ مگر تیل اور تیل کی دھار دیکھ کر اس کا جوش جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور وہ پھر آہستگی سے کھیلنے پہ مجبور ہو گیا۔ کامپٹن اور گریونی دونوں مدھم رفتار سے کھیل رہے تھے اور کافی چوکنے نظر آرہے تھے۔ یہ دونوں کھلاڑی صرف اس وقت ہی "دوڑ" بنا پاتے جب ہمارے باؤلر کی گیند "گڈ لینگتھ" سے اِدھر یا اُدھر گرتی۔ کامپٹن اتنی احتیاط کے باوجود مبدم مبدم اسکور میں اضافہ کیے جا رہا تھا اور اس کا حوصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ ۹۳ رنز بنا چکا تو غالباً سینچری کا دل خوش کن تصور اس کے ذہن میں رقص کرنے لگا۔ اور اس کی بیٹنگ میں دوبارہ شدّت پیدا ہو گئی۔ کامپٹن کے مدِّ مقابل اس وقت شجاع الدین کھڑا تھا۔ شجاع نے بھی پورا زور لگا کر گیند پھینکی۔ کامپٹن کے پاس گیند کا پہنچنا تھا کہ اس نے پھر "کٹ" لگانے کی کوشش کی مگر گیند بیٹ کے سینے پہ داغ چھوڑ کر جلدی سے امتیاز کی ہتھیلیوں میں پناہ گزیں ہو گئی اور کامپٹن بھی اسی حادثے کا شکار ہو گیا جس سے پیٹرمے کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ کامپٹن کے بعد پارکس کو آزمائش کیلئے بھیجا گیا۔ پارکس بے چارہ

پہلی مرتبہ ٹسٹ میچ میں شرکت کر رہا تھا۔ وہ جب گراؤنڈ میں پہنچا تو اس کے اوسان خطا تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے مُردہ دِلی سے بیٹنگ شروع کی اور بالکل بے جان شاٹس کھیلنا شروع کئے۔ نتیجے کے طور پر انگلستان کے اسکور میں جمود پیدا ہو گیا۔ لے دے کے بس ایک گریونی تھا جو دوسرے کنارے سے تھوڑی بہت ہمت کئے جا رہا تھا۔ گریونی شجاع کی روک تھام کرتا انفرادی طور پر اپنے اسکور کو ۵۶ تک لے جا چکا تھا کہ اس کی بدقسمتی نے اُسے ہٹ لگانے پر اُکسایا مگر گیند اور بیٹ کی صحیح وقت پر مڈبھیڑ نہ ہو سکی اور قبل اس کے کہ وہ اپنی کریز پر پہنچتا امتیاز نے گیند کو دبوچ کر اسے "سٹمپ" کر دیا اور اس کی جگہ پر ایونز آ کھڑا ہوا۔

گریونی کی رخصتی پر میں نے دوسری سمت سے پارکس کو کھلانا شروع کیا اور میں جلد ہی بھانپ گیا کہ پارکس اپنی لیگ سٹمپ کو خالی چھوڑ کر "مڈل سٹمپ" اور "آف سٹمپ" پر کھیلتا ہے۔ لہٰذا میں نے فوراً ایک عدد "لیگ کٹر" اس کی "لیگ سٹمپ" سے ذرا باہر کی طرف پھینکی اور گیند حسبِ توقع "لیگ سٹمپ" کے

شانے سے شانہ بھڑاتی پارکس کو شکست قبول کرنے پر مجبور
کر گئی۔ اس اچانک حادثے پر پارکس کے علاوہ پاس کھڑا
محمود حسین بھی بھونچکارہ گیا اور پارکس بے چارے کو فقط ۱۵ رنز
کے عوض "اولڈ ٹرافرڈ" کی گراؤنڈ چھوڑ دینی پڑی۔ پارکس کی ناکامی
کے بعد وارڈل آیا اور ایونز کے ساتھ مل کر تیزی کے ساتھ کھیلنا شروع
کیا۔ ان دونوں کھلاڑیوں کی بیٹنگ نے انہیں کھیل کے اختتام تک
"ناٹ آؤٹ" رکھا۔ شام کو انگلستان اپنے کھلاڑیوں کے بدلے
۲۹۳ رنز حاصل کر چکا تھا۔

ہم جب گراؤنڈ سے ہوٹل کی جانب چلے تو بادل گھر گھر کر آ رہے
تھے اور سبھی کا خیال تھا کہ رات ضرور مینہ برسے گا۔ ہمارا خیال
درست ہی نکلا اور رات کو موسلادھار بارش ہوتی رہی حتیٰ
کہ صبح کو جب گراؤنڈ کا رُخ کیا تو رم جھم جاری تھی اور خیال و اثق
تھا کہ میچ نہ کھیلا جا سکے گا۔ چنانچہ وہاں پہنچے تو دونوں کپتانوں
نے گراؤنڈ کی حالت دیکھ کر میچ کے التوا کا اعلان کر دیا اور دوپہر
بارہ بجے کے قریب ہماری ٹیم واپس کوئنز ہوٹل جا دھمکی۔ ہوٹل

پہنچتے ہی میری نیت خراب ہوگئی اور میں نے آرام سے بیٹھنے کی بجائے موسم کے مطابق شاپنگ کرنے کی ٹھانی — میں نے ساتھ اسلم کو لیا اور ہم دونوں نے برساتیاں اوڑھ اونی کپڑوں کی نگری مانچسٹر کے بازاروں میں مٹرگشت کرنا شروع کردی۔ غیر معمولی سردی نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا لہٰذا ہم نے انگلستانی پونڈ پانی کی طرح بہائے اور خوب گرم کپڑے خریدے اور تقریباً چار بجے شام اپنی بغلوں میں کپڑوں کے بنڈل داب واپس ہوٹل پہنچے۔ بارش ابھی تک جاری تھی اور تمام رات ہوتی رہی۔ صبح بیدار ہوئے تو مینہ بند ہو چکا تھا۔ لیکن تازہ تازہ کیچڑ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ بارش ابھی تھمی ہے۔ موسم کو مدِنظر رکھتے ہوئے اندازہ یہی تھا کہ میچ آج بھی نہ ہو سکے گا۔ بہرحال ہم ٹیکسیوں میں بیٹھ کر گیارہ بجے کے قریب گراؤنڈ پہنچے اور دیکھا کہ پانچ سات آدمی گراؤنڈ خشک کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ تو کمبل کے ذریعے نمی کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور دو تین ایک مشین کی مدد سے زمین خشک کرنے کی جدوجہد میں مشغول تھے۔ ہم تھوڑی

دیر یہ منظر دیکھتے رہے۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ خشک ہوتی نظر آنے لگی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد شیپرڈ اور کاردار نے وکٹ کا معائنہ کیا۔ شیپرڈ نے کھیل شروع کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن کاردار نے عدم رضامندی کا اظہار کیا اور دونوں نے معاملہ امپائرز کے تصفیہ پر چھوڑ دیا۔ امپائرز نے تھوڑی دیر کے غور وخوض کے بعد شیپرڈ کی رائے کو لبیک کہا اور پورے ساڑھے بارہ بجے کھیل شروع کرنے کا فیصلہ دے دیا۔ اسی اثنا میں گراؤنڈمین کو زیادہ گیلے حصوں پر لکڑی کا برادہ پھینکنے کی ہدایت کی گئی اور آن کی آن میں ساری گراؤنڈ بُرادے کے نیچے چھپ گئی۔

پورے ساڑھے بارہ بجے کھیل شروع ہوا۔ انگلستان کی طرف سے بدستور وارڈل اور ایونز بیٹنگ کے لئے تیار کھڑے تھے۔ میں نے پاکستان باؤلنگ کا افتتاح کرتے ہوئے پہلی گیند ایونز کو پھینکی۔ گراؤنڈ ابھی تک سخت گیلی تھی اور دوڑتے ہوئے ہر قدم پر گرنے کا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ مَیں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر بہت سا برادہ منگوا کر اپنی دوڑنے والی جگہ پر پھینکوا لیا تاکہ کھیل ہی کھیل میں

کہیں ہڈی پسلی ایک نہ ہو جائے۔ وکٹ باؤلر کے علاوہ بیٹسمین کے لئے بھی عذابِ جان تھی۔ گیند وکٹ سے ٹکر کھا کر ایسے عجیب و غریب انداز میں گھومتی اور اوپر اٹھتی۔ کہ بیٹسمین کے لئے گیند کو سنبھالنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ میں نے اسی طرح ایونز کو چار گیندیں پھینکیں لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہ ہوا۔ جب میں نے پانچویں گیند پھینکی تو ایونز سلپ کی طرف کھیلا جہاں حنیف نے نہایت آسانی سے گیند کیچ کر لی اور ایونز اپنے پہلے روز کی بنائی ہوئی ۳۱ رنز میں کوئی اضافہ کئے بغیر آرام گاہ کو چل دیا۔

دوسرے لمحے ایونز کے بدل میں بیڈسر کو بھیجا گیا اور اس نے بڑی تحمل مزاجی سے کھیلنا شروع کیا۔ اس کے برعکس دوسرے کنارے پر کھڑا واڈل نہایت چستی سے کھیل رہا تھا اور کافی عرصے شجاع کی گیندوں کی پٹائی کر رہا تھا۔ رنز بازی کے چکر میں واڈل میرے مدِ مقابل آگیا۔ وہ اس وقت تک ۵۴ رنز بنا چکا تھا۔ جب میں نے گیند اندازی شروع کی تو اس نے وحشیانہ طور پر بیٹ گھما کر میری گیند کو پورے زور سے ہٹ لگائی لیکن شدتِ جذبات نے

گیند اور بیٹ کی ملاقات اچھی طرح نہ ہونے دی اور گیند ہوا کے دوش پر تیرتی وقار حسن کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ چنانچہ وارڈل کو بھی پیٹرمے اور کامپٹن کی طرح ہٹ جھنگی پڑی اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلتا آرام گاہ میں پہنچ گیا۔

وارڈل کا خلا پُر کرنے کے لئے مکانن آیا اور بیڈسر کے ساتھ مل کر کھیلنا شروع کیا۔ لنچ ٹائم سے کچھ عرصہ پیشتر تک یہ دونوں کھلاڑی غالباً ۲۰ رنز بنا چکے تھے کہ کپتان شیپرڈ نے ۳۵۹ کا اسکور تسلی بخش سمجھا اور اپنے کھیل کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

دونوں ٹیموں نے دوپہر کا کھانا اکٹھے مل کر کھایا اور تقریباً دو بجکر دس منٹ پر پاکستان نے اپنی پہلی اننگز کا آغاز کر دیا۔ حنیف اور امتیاز بیٹنگ کے لئے نکلے اور اُدھر سے بیڈسر اور سٹیدھم نے باؤلنگ شروع کی۔ وکٹ اب کافی خراب ہو چکی تھی اور گیند وکٹ سے ٹکرا کر نہ صرف بہت زیادہ گھومتی بلکہ کبھی نیچے رہ جاتی اور کبھی بہت اونچی چلی جاتی۔ ہمارے بیٹسمین کھیلنے میں انتہائی دقت محسوس کر رہے تھے بس ایک حنیف تھا جو تحمل مزاجی کے ساتھ

خوب اچھی طرح کھیل رہا تھا اور نہ باقی کھلاڑی بددلی سے گراؤنڈ میں جاتے اور پانچ پانچ دس دس رنز بنا کر منہ بسورتے واپس چلے آ رہے تھے۔ میں ابھی گراؤنڈ میں نہیں گیا تھا اور ڈریسنگ روم میں بیٹھا ہوا کھیل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ پیٹر ویسٹ کی آواز نے میری تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کرالی وہ میچ کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو کے ذریعے نشر کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وکٹ میں ما سوا اس کے اور کوئی نقص نہیں کہ گیند وکٹ سے ٹکرا کر ذرا گھومتی ہے۔ مجھے پیٹر ویسٹ ایسے مبصر کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر سخت کوفت ہوئی کیونکہ میچ میں موجود ہر شخص کا یہی خیال تھا کہ بارش کے باعث وکٹ بالکل خراب ہو چکی ہے۔ چنانچہ جب میری باری آئی اور میں کریز پر پہنچا تو دوسری طرف سے وزیر محمد کھیل رہا تھا جو میرے جانے کے فوراً ہی بعد آؤٹ ہو گیا۔ اس سے پیشتر کہ اس کی جگہ خالد وزیر آ کر سنبھالتا میں نے اس وقفے میں ایونز گرہ یونی، کامپٹن اور مکانن سے وکٹ کے متعلق گفتگو کی۔ اور انہوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہی کہا کہ

ایسی وکٹ پر بیٹسمین کو ہرگز نہ کھیلنا چاہیئے۔ خود ان کی زبان سے
اعتراف کرانے کے بعد میں نے انہیں پیٹر ولیسٹ کے تبصرے
کا حوالہ دیا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ بہرحال میں بھی اپنے ساتھیوں
کی طرح صرف ۹ رنز بنا کر بیڈسر کے ہاتھوں آؤٹ ہوگیا اور
وکٹ کو کوستا پیویلین میں جا پہنچا۔ ہمارے بقیہ کھلاڑیوں کا بھی یہی
حشر ہوا اور اننگز کے اختتام تک شجاع کے سوا ہماری ساری
ٹیم ۹۰ رنز کے عوض میدان چھوڑ گئی۔

شام کی چائے کے بعد ہماری دوسری اننگز شروع ہوئی۔
اور حالت ویسی ہی پتلی رہی چنانچہ ہم اس دن کے کھیل کے
خاتمے تک چار کھلاڑیوں کے بدلے صرف ۲۵ رنز حاصل کر سکے
اس نتیجے کو دیکھ کر ہار یقینی نظر آرہی تھی۔ چنانچہ جب ہم ہوٹل کو لوٹے
تو سب کی یہی تمنا تھی کہ کاش خداوند تبارک تعالےٰ باقی دو دن
مسلسل اپنی رحمت سے نوازتا رہے۔ پر یہ کہ بقول علامہ اقبالؒ،
دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ لہٰذا ہم سب کی دعائیں
بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئیں۔ اور دو دن متواتر وہ بارش ہوئی کہ تیسرا

ٹسٹ میچ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر خود بخود برابر ہوگیا۔

"اپنی دعا تو ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔" میں نے کاغذات ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

"کس بات کے لئے" فضل بولا "یہی کہ قادرِ مطلق آپ کو یہ انٹرویو جلد از جلد ختم کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور میری مشکلیں آسان ہو جائیں۔" میں نے ذہنی تکان دور کرنے کے لئے سگریٹ سلگایا۔ "تو پھر آپ دعا خلوصِ دل سے نہیں مانگتے ہوں گے۔" فضل مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"معرکۂ اوول کی سرگذشت کب سنائی جائے گی۔" میں نے فائل بغل میں دبائی اور ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال لئے۔ "پرسوں" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "کام بہت ہے اور اترسوں آپ نے چلے جانا ہے۔" میں نے وعدہ استوار کرنا چاہا۔ "کہانی پوری کئے بغیر نہیں جاؤں گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہت اچھا۔" میں نے آخری لمحات میں تکرار کرنی مناسب نہ سمجھی اور "شب بخیر" کہہ کر گھر چلا آیا۔

تین تاریخ کی دوپہر کو میں اُسے ملاوہ ملاقاتیوں کے خوف سے گھر سے فرار ہو کر دفتر میں دروازہ بند کر کے چھپا بیٹھا تھا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا اور چائے وغیرہ پی کر سگریٹ کے تین چار پیکیٹ میز پر رکھ دیئے۔ "ہاں جی" میں نے پیکیٹ کا بالائی کاغذ چیر مُڑ کر کے پھینکا اور سگریٹ سلگا کر تمام تر توجّہ اس کے چہرے پر مرکوز کر دی۔ "ایک منٹ" فضل بولا۔ اور سگریٹ سُلگا کر کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ تقریباً پانچ دس منٹ اسی حالت میں رہا۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ جذباتی ہیجان کی کماحقہٗ ترجمانی کر رہا تھا۔ اور جب وہ مکمّل طور پر مُوڈ میں آگیا تو آرام کرسی پر آبیٹھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"انعام صاحب" اس نے کرسی کے بازو باہر نکالے اور ٹانگیں پسار کر دونوں ہاتھوں کی قینچی سی بنالی "فرمائیے" میں ایک طویل کش لیتے ہوئے بولا۔ "آج میں آپ کو وہ کارنامہ سنانے لگا ہوں جو میری کرکٹ لائف کا نقطۂ عروج ہے۔" اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "پھر" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"مجھے ڈر کیئے گا نہیں"۔ وہ فضا میں سگریٹ کا دھواں بکھیرتے ہوئے بولا "آپ فکر نہ کیجئے"۔ میں نے ایک ہاتھ اپنے پیڈ پر رکھ لیا اور دائیں ہاتھ میں پنسل مضبوطی سے پکڑ لی۔ "اس ٹیبل لیمپ کا رُخ اپنی طرف کر لیجئے" اس نے آخری ہدایت دی۔ میں نے لیمپ کو پکڑ کر شیڈ عین پیڈ کے اوپر کر دیا۔ میری ساکت پنسل اس کی جنبشِ لب کی منتظر تھی۔ فضل نے دو چار لمبے لمبے کش لگائے۔ چند ثانیوں کے لئے اس کی کشادہ پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔ اور پھر بقیہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر داستان کی منتہا کا آغاز کر دیا۔

"تیسرے ٹسٹ میچ سے فارغ ہو کر ہم سمرسٹ، گلیمرگن، واروک اور گلوسٹر شائر کی کاؤنٹیوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئے لیکن بارش کی مداخلت نے ان چاروں میچوں کا نتیجہ مساوی رکھا اور ہار جیت کا فیصلہ نہ ہونے دیا۔

۱۲ اگست کو اوول کے تاریخی میدان میں پاکستان ٹیم کی آخری اور کڑی آزمائش تھی لہٰذا ۱۰ تاریخ کی شام کو ہم گلوسٹر سے لندن پہنچ گئے اور برنرز ہوٹل میں جا دم لیا۔ چوتھا ٹسٹ میچ ہمارے لئے بیحد

اہم تھا کیونکہ پاکستان کرکٹ کی ساکھ کا تمام تر انحصار اسی میچ پر تھا۔ اگرچہ گذشتہ تین آزمائشی میچوں میں دو مرتبہ پلہ برابر رہا۔ مگر دوسرے ٹسٹ کی ناکامی کو متوازن کرنے کی خاطر چوتھے ٹسٹ میچ میں نمایاں کامیابی حاصل کرنی ناگزیر تھی جس کے لئے ہمارا ہر کھلاڑی بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا تاکہ "ٹیسٹ ربر" سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں اور ملکی وقار پر بٹہ نہ لگے۔

انگلستان کو بھی اسی قسم کی تشویش لاحق تھی کیونکہ بالفرض اوول ٹیسٹ میچ برابر بھی رہتا تو اس ٹیم کے لئے یہ کوئی قابل فخر کارنامہ نہ تھا جو چوتھے ٹیسٹ میں حصّہ لے رہی تھی۔ لین ہٹن اب صحتیاب ہو چکا تھا اور حسب سابق ٹیم کی قیادت اس کے ذمے تھی نیز انگلستان کے انتخابی بورڈ نے اس بار زیادہ تر زور حملہ آوروں پر صرف کیا اور کپتان ہٹن کی زیر کمان فاسٹ باؤلرز سٹیتھم، ٹائسن اور لوڈر کے ساتھ مکانن اور وارڈل ایسے دو سپنرز بھی شامل کر دیئے تاکہ مقابلے کے وقت پاکستانی بیٹنگ کا منہ پھیر دیا جائے۔ دفاعی گروپ بھی اپنی جگہ ناقابل شکست تھا۔ ہٹن، کامپٹن، مے، سمپسن، گریونی اور ایونز

کے بیٹ پاکستان باؤلنگ کے پرخچے اڑا سکتے تھے۔ مزید برآں
بوقت ضرورت سپن باؤلر وارڈل کی قوت بھی اس سلسلے میں استعمال
کی جا سکتی تھی۔ غرض انگلستان کی ٹیم ہر لحاظ سے لیس تھی اور انہوں
نے جیت کو یقینی بنانے کا ہر ممکن انتظام کر رکھا تھا۔ مخالف ٹیم کے
ارکان سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اگر میں پیش از وقت ہی
اپنی کامیابی کا یقین کر لیتا تو یہ بلاشبہ میری خوش فہمی ہوتی کیونکہ اُن
کھلاڑیوں کا تجربہ وسیع ہے اور فنی مہارت مسلّمہ تاہم میرے دماغ میں
ایک خیال پختگی سے جاگزین تھا کہ بن مرے مارے اس میچ کا تصفیہ
نہ ہونے دوں گا اور قوم اور ملک کے وقار کی خاطر زندگی کا اہم
ترین رول سرانجام دوں گا خواہ مجھے جان کی بازی لگانی پڑے
—— اور پھر یہی وہ لمحات تھے جن کے انتظار میں مجھے کم و بیش
ایک سال کا طویل عرصہ گذارنا پڑا اور یہی وہ آزمائش تھی جس میں
پورا اُترکر میرے جاگتے کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتے تھے۔ میری
نگاہوں کے سامنے بار بار ہٹن کا لہراتا ہوا ہاتھ اُبھرتا اور مجھے میرا "عہد"
یاد دلا کر جھنجھوڑتا —— اور پھر جوں جوں گذشتہ سال کی یادوں

کے نقوش ذہنی سطح پر ابھرتے آئے میرا حوصلہ بلند اور اعتماد اٹل
ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۱ اگست کی سرد اور بھیگی رات کو جب سب
کھلاڑی اپنے اپنے بستروں پر لیٹے آنے والے کل کے متعلق تانے
بانے بُن رہے تھے مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں اوول کے میدان
میں ضرور غیر معمولی کھیل کا مظاہرہ کروں گا۔ رات ابھی کافی باقی تھا
اور میں سوچ رہا تھا کہ کل صبح بین الاقوامی میدان میں بین الاقوامی
معیار کی کسوٹی پر دو قوموں کی قوت اور صلاحیتوں کو ہزاروں
لوگوں کے سامنے جانچا جائے گا — خدا کرے کہ آٹھ کروڑ پاکستانی اپنی
نمائندہ جماعت کے ذریعے اس معیار پر پورے اُتریں اور یہ ثابت ہو جائے
کہ ہم زندگی کی ہر دوڑ میں زندہ قوموں کے شانہ بشانہ چلنے کی قوت رکھتے
ہیں تمام رات میں نے انتہائی کرب و اضطراب میں گذاری۔ بارے صبح ہوئی
اور ہم ٹیکسیوں میں بیٹھ کر ساڑھے دس بجے کے قریب اوول گراؤنڈ میں
پہنچے۔ گذشتہ رات رم جھم ہوتی رہی تھی اس لئے گراؤنڈ بھیگی ہوئی تھی۔
البتہ وکٹ بارش کے اثر سے محفوظ تھی چونکہ اسے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے
ڈھانپ رکھا تھا۔ بہ حال کھیل وقتِ مقررہ سے گھنٹہ بھر بعد شروع ہو سکا۔

اور کاردار نے ٹاس جیت کر پاکستان اننگز کے افتتاحی جوڑے حنیف اور علیم کو امتحان گاہ میں بھیج دیا۔ انگلستان کی طرف سے سٹیدھم اور ٹائسن مقابلے پر نکلے اور سٹیدھم نے حنیف کو پہلا اوور پھینکنا شروع کیا۔ سٹیدھم کی پہلی چار گیندوں پر تو خیریت گذری لیکن جب اس نے پانچویں گیند پھینکی تو حنیف "ہک شاٹ" کھیلنے کی کوشش میں اپنے پیڈ گیند کی زد سے نہ بچا سکا اور امپائر نے اسے ایل۔ بی۔ ڈبلیو قرار دے کر کریز چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ حنیف ایسے قابل اعتماد بیٹسمین کا بغیر کوئی اسکور بنائے یوں بے دست و پا ہونا پاکستانی ٹیم کے لئے بہت بڑا المیہ تھا۔ اس کا یہ حشر دیکھکر ہمارے دلوں پر ایک بجلی سی گری اور اس غیر متوقع حادثے نے ہماری بالکنی میں لحظہ بھر کیلئے سناٹا طاری کر دیا۔ خان محمد پہلے ہی علالت کے سبب شرکت نہیں کر رہے تھے اوپر سے حنیف کو بھی پوری اننگز کے لئے بیکار کر دیا گیا۔ باقی رہ گئے کاردار، میں، امتیاز، مقصود، وقار، وزیر محمد، ذوالفقار، شجاع محمود حسین، بارھواں کھلاڑی خالد وزیر اور میدان میں کھڑا علیم جن کے شانوں پر پہلی اننگز کی ذمہ داری تھی۔ بہر کیف حنیف کی جگہ وقار کو بھیجا اور سب کی دعائیں تھیں کہ کم از کم علیم اور وقار ہی جم کر کھیلنے لگیں

تاکہ تھوڑا بہت اسکور ہو جائے۔

وقار کے گراؤنڈ میں پہنچنے پر دوسرے کنارے پر کھڑے چھ فٹ لمبے جوان ٹائسن نے گیند سنبھالی اور ۱۸، ۱۹ گز کی دوڑ لگا لگا کر وحشیانہ انداز میں علیم کو گیندیں پھینکنی شروع کیں۔ ٹائسن کی تیز باؤلنگ کے متعلق میں نے غائبانہ طور پر بہت کچھ سن رکھا تھا اور اس دن اسے کھیلتے دیکھ کر اعتراف کرنا پڑا کہ وہ واقعی دنیا کے چند گنے چنے گیند اندازوں میں سے ہے۔ وہ اتنی شدت اور برق رفتاری سے باؤلنگ کر رہا تھا کہ گیند وکٹ سے ٹکرا کر غیر معمولی بلندی تک جاتی۔ علیم نے ٹائسن کے اسی اسٹائل سے فائدہ اٹھایا اور اس نے ان دونوں گیندوں کو چوکے لگائے جو وکٹ پر زور سے گرنے کے بعد اس کے سر کے نزدیک سے گذر رہی تھیں۔ علیم کی دونوں چوٹوں پر گیند سلپ فیلڈرز کے سروں سے اوپر ہوتی ہوئی باؤنڈری پر جا رُکی۔ علیم نے دو چوکے تو لگائے لیکن ٹائسن کی شدید باؤلنگ کے سامنے وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا اور صرف دس رنز کے عوض میدان چھوڑ گیا۔ علیم کی جگہ سنبھالنے کے لئے مقصود اُٹھا اور دوسرے کنارے سے سٹیدھم نے وقار کو کھلانا شروع کیا۔ سٹیدھم تین چار اوور پھینک چکا تو ہٹن نے اُسے

واپس بلا کر لوڈر کو آزمایا۔ ہٹن کا انتخاب غلط نہ تھا کیونکہ لوڈر نے وقار کا اسکور سات سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ابھی ہم وقار کی ناکامی پہ ہی کفِ افسوس مل رہے تھے کہ مقصود کا انجام کچھ زیادہ ہی افسوسناک ہوا اور اس کے حریف ٹائیسن نے اُسے پاکستان کے اسکور میں ایک نمبر کا بھی اضافہ کرنے کی مہلت نہ دی اور پہلے ہی اوور میں وکٹ آؤٹ کر کے اُسے واپس پویلین میں بھیجدیا۔ الغرض ٹائیسن، سٹیدھم اور لوڈر کی تیز باؤلنگ نے ہماری کل ٹیم کو کھیل کے اختتام سے پانچ منٹ پیشتر فقط ۳۳ رنز کا معاوضہ دے کر آؤٹ کر دیا یہ قلیل سا اسکور بھی شجاع الدین، ذوالفقار اور محمود حسین کی کوشش کا مرہونِ منّت تھا جنہوں نے آخری لمحات میں مل جل کر ۵۵ رنز بنا لیں۔ اس دن کے باؤلنگ آنرز ٹائیسن، لوڈر اور سٹیدھم کو گئے اور ان کھلاڑیوں نے بالترتیب ۴، ۳ اور ۲ وکٹیں حاصل کیں۔

پاکستان کی پہلی اننگز کے خاتمے پہ ہٹن نے سمپسن کے اشتراک میں انگلستان کی اوّل اننگز کا آغاز کیا۔ کھیل کے اختتام میں فقط پانچ منٹ باقی تھے اور اتنے تھوڑے سے وقفے میں کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے مکمل حفاظتی تدابیر اختیار کیں اور دونوں بیٹسمینوں کو فیلڈرز کی مدد سے بالکل محصور

کر کے پاکستان باؤلنگ کا افتتاح کر دیا۔ میرے سامنے میرا مطلوبہ بیٹسمین ہٹن تھا میں نے خوب محتاط ہو کر اُسے پہلا اوور پھینکا جو میڈن رہا۔ چنانچہ دوسری طرف سے محمود حسین نے اپنے پہلے اوور کی ابتدا کی جس کے تمام ہونے تک سمپسن دو رنز بنانے کا موقع پا گیا۔ اتنی دیر میں کھیل بند کرنے کا وقت ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس دن کا کھیل ختم کر دیا گیا اور پچیس تیس ہزار تماشائی تذبذب کے عالم میں گھروں کو چل دیئے۔

میدان سے نکل کر ہم سبھی افسردہ دل تھے کیونکہ ہمارا کل اسکور قطعی طور پر غیر تسلی بخش تھا۔ اور سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پاکستانی باؤلرز انگلستان کے ٹوٹل اسکور کو بھی ۱۳۳ کے ہندسہ سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ گو یہ کام ممکن تو ضرور تھا مگر اچھا خاصا مشکل بھی تھا۔ ہم انہی خیالات میں مستغرق برنز ہوٹل پہنچے۔ لان میں متعدد انگریز بیٹھے ہوئے تھے اور ہر ایک کا چہرہ ہماری شکست کو یقینی سمجھنے کی غمازی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چند انگریز میرے پاس آئے اور کرکٹ کے موضوع پر تبادلہ خیالات شروع کر دیا اور ان میں سے کسی ایک نے بظاہر میری ڈھارس بندھاتے ہوئے طنزاً کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کرکٹ میں سبھی کچھ ممکن

ہے۔ اجنبی ملاقاتیوں کی دلسوز ہمدردی نے میرا کلیجہ جلا دیا لیکن قہر درویش برجانِ درویش ضبط سے کام لیا اور یہی کہا کہ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے بھلا کرکٹ میں کیا کچھ ممکن نہیں وہ یہ جملہ سن کر میرا مدعا سمجھ گئے لیکن انگلستانی ٹیم پر مکمّل اعتماد کے باعث سب کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے بھی فقط اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ دورانِ گفتگو یہاں تک کہہ دیا کہ ایک اوور میں چھ کھلاڑی بھی آؤٹ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ بات کہنے کو تو میں نے کہہ دی لیکن مجھے پختہ یقین تھا کہ میرے مخاطب اسے مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیّت نہ دیں گے۔ الغرض ان کے ساتھ کوئی آدھ گھنٹہ بحث مباحثہ جاری رہا اور پھر شام کا کھانا کھانے کے بعد میں سونے کے لئے کمرہ میں چلا گیا۔

صبح بیدار ہوا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بھر بوندا باندی ہوتی رہی ہے۔ خیر ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر تیاری کی اور ٹیکسیوں میں بیٹھ جذبی کے اس شعر کو باقاعدہ قوالی کی صورت میں الاپتے اوول گراؤنڈ کی سمت چل دیئے ؎

آتا ہے جو طوفاں آنے دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے
مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آ جائے

وقار حسن، محمود حسین، شکور، ذوالفقار اور میں اپنی ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے یہ شعر گا گا کر قوتِ ارادی کو تقویت دے رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اللہ میاں کے حضور گڑ گڑا کر دعا بھی مانگی جا رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح انگلستان کی ٹیم پاکستان سے زیادہ اسکور نہ کرنے پائے۔ ہم نے ۴۲ میل کا سفر اسی طرح قوالی کرتے اور دعائیں مانگتے طے کیا اور کوئی ۱۱ بجے کے قریب گراؤنڈ پہنچے۔ وقتِ مقررّہ تک غالباً ہماری دعائیں قبول ہو گئیں اور ایک سیاہ بدلی شمال سے اٹھ کر جنوب کی جانب بڑھی اور دوسرے لمحے کھیل شروع ہونے کی بجائے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ چند منٹ مینہ اتنے زور سے برستا رہا کہ گراؤنڈ ایک تالاب معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ میچ مجبوراً ایک روز کے لئے ملتوی کرنا پڑا اور ہم سب واپس ہو لئے۔ ہوٹل پہنچ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ لندن کے گرد و نواح میں نمی کا نشان تک نہ تھا اور غالباً بارش صرف اوول کے میدان میں ہوئی۔

اگلی صبح یعنی مورخہ ۱۴ اگست کو اوول پہنچنے کی تیاری شروع کی تو میرے دل میں ایک عجیب و غریب وہم پیدا ہوا اور میں نے نیا لباس

زیب تن کرنے کی بجائے وہ میلی پتلون اور خستہ حال بوٹ نکالے جنہیں پہن کر میں نے لکھنؤ ٹسٹ میچ میں ۹۲ رنز کے عوض ۱۲ وکٹیں حاصل کی تھیں اور بھارتی ٹیم کو شکست فاش دی تھی۔ مجھے یقین کامل تھا کہ میرا پرانا مگر مبارک جوڑا لکھنؤ کی طرح اوول کے میدان میں بھی مجھے کامرانی سے ہمکنار کرے گا۔ اگرچہ اس وہم کی حقیقت خود فریبی سے زیادہ نہ تھی لیکن میں اپنے اعتماد کو تقویت دینے کی خاطر مختلف حربے استعمال کر رہا تھا۔ تمام کھلاڑی تیار ہو چکے تو ہم دل میں طرح طرح کی تجویزیں سوچتے گراؤنڈ پہنچے۔ گزشتہ روز کی بارش کا اثر ابھی کلی طور پر زائل نہ ہوا تھا لہٰذا کھیل وقتِ مقررہ سے ایک گھنٹہ بعد شروع ہوا اور پاکستان کی طرف سے محمود حسین اور میں ہٹن اور سمپسن کے مقابلے کو نکلے جس وقت میں گراؤنڈ میں داخل ہو رہا تھا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا تاکہ انگلستان ۱۳۳ سے زائد اسکور نہ کر سکے۔

میرے سامنے ہٹن کھڑا تھا اور اس کا بیٹ میری گیند کو ہٹ لگانے کے لئے بیتاب تھا۔ مجھے ہٹن کی قابلیت کا علم اور اس کی بیٹنگ کے کمالات سے پوری پوری آگاہی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرا حریف

اپنی مسلمہ فنی چابکدستی کے سبب ماسٹر لین ہٹن کے نام سے یاد کیا جاتا
ہے ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر میں اپنے دماغ کے جملہ کل پرزے
حرکت میں لایا اور اُسے ناکام بنانے کے لیئے ذہن میں ایک واضح خاکہ
مرتب کیا کہ ہٹن سے نمٹنے کے لئے مجھے کس نوعیت کی گیند اندازی سے
کام لینا ہوگا۔ میں نے پہلے اوور کی ابتدا سے قبل سارا منصوبہ ذہن نشین
کرلیا اور کھیل شروع ہونے پر چھ کی چھ گیندیں "ان سونگر" پھینکیں اور "آؤٹ
سونگر" اور "لیگ کٹر" کی جھلک تک نہ دی۔ اپنے دوسرے اوور میں میں
نے چپکے سے ایک "آؤٹ سونگر" آزمائی۔ ہٹن "ان سونگر" کے مغالطے میں
گیند پیٹنے کے لئے آگے بڑھا مگر گیند اُسے جل دے کر وکٹ کی جانب
بڑھی اور قریب تھا کہ وہ اسی گیند پر بیٹ سے ہاتھ دھو بیٹھتا لیکن میری
بدقسمتی کہ گیند وکٹ سے ٹکرانے کے باوجود "بیلز" نہ گرا سکی اور ہٹن بال
بال بچ گیا۔ یہ سنہری موقع کھونے کے بعد میں نے پھر چال بدلی اور ایک
عدد "لیگ کٹر" کا امتحان کیا۔ گیند بیٹ سے چوٹ کھا کر تیزی سے "سلپس"
کی طرف گئی مگر کیچ نہ ہوسکنے کے سبب باؤنڈری تک جا پہنچی اور ہٹن
کو اطمینان سے چار رنز بنانے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ دوسری طرف سے

محمود حسین نے سمپسن کو کھلانا شروع کیا اور اس کی ایک گیند گڈ لینگتھ پر گر کر بہت تیزی کے ساتھ اوپر کو اٹھی اور سمپسن کے دستانوں سے چھوتی ہوئی نزدیک کھڑے کارڈار کے ہاتھوں میں چلی گئی اور سمپسن غریب کو فقط دو رنز کے عوض میدان چھوڑنا پڑا۔ انگلستان کے پہلے بیٹسمین کا بے نیل و مرام آرام گاہ کو لوٹ جانا بے شک باعثِ مسرت تھا لیکن پھر بھی دل کو اطمینان نہ تھا کیونکہ ابھی ان کی ساری ٹیم صحیح سالم پویلین میں بیٹھی تھی۔ الغرض سمپسن کی جگہ پیڑ مے آکھڑا ہوا اور میں نے دوسرے کنارے سے پھر ہٹن کے ساتھ زور آزمائی شروع کر دی۔ ہٹن میری خلافِ اندازہ باؤ لنگ سے الجھن میں پھنس گیا اور رفتہ رفتہ اس قدر دِق ہو گیا کہ تنگ آ کر اندھا دھند ہٹ لگانی شروع کر دیں اور میری دو گیندوں پر باؤنڈریاں لگا دیں۔ ہٹن کا تجربہ چونکہ کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ایک بار پھر میری "لیگ کٹر" گیند کو اتنے زور سے ہٹ لگائی کہ گیند فضا میں دور تک چلی گئی۔ امتیاز احمد نے موقع غنیمت سمجھ کر اس کا تعاقب کیا اور دوسرے لمحے امتیاز کی محنت کا پھل اس کے ہاتھ میں تھا۔ گیند کا کیچ ہونا تھا کہ پاکستان اسٹینڈ سے قیامت کا شور اٹھا اور تماشائی دیوانگی کے



اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

اوول ٹیسٹ میچ میں فضل محمود کی گیند پر سلپ کی طرف کیچ نکلا۔ مگر ذوالفقار انتہائی کوشش کے باوجود کاٹین کو
پکڑ نہ کرسکے۔

عالم میں تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگے۔ نعروں کا شور مدھم ہونے تک دنیا کا عظیم بیٹسمین ماسٹر لین ہٹن سر جھکائے پویلین کی سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا اور اس کی تمام تر فنی صلاحیتیں انگلستان کو صرف ۴ رنز کا سرمایہ دے سکیں۔ ہٹن کا خلا پُر کرنے کے لئے ڈینس کامپٹن کو بھیجا گیا اور اس نے پیٹر مے کے ساتھ مل کر دلجمعی سے کھیلنا شروع کر دیا۔ وکٹ اب باؤلرز کے لئے مفید ہوتی جا رہی تھی اور میں وکٹ سے کافی مدد لے رہا تھا۔ میں گیند کو جتنی سپن دینا چاہتا وہ لیتا لہٰذا میرے کھیل میں مزید تبدیلی پیدا ہو گئی جس کی بنا پر کامپٹن اور مے تذبذب کے عالم میں کھیل رہے تھے اور میری گیندوں کو سنبھالنے میں کافی دقت محسوس کر رہے تھے کیونکہ انہیں باؤلنگ کی نوعیت کا ٹھیک سے پتہ نہ چل رہا تھا۔ میں انہیں سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق کھلا رہا تھا چنانچہ ہٹن کے بعد میری باؤلنگ کا نشانہ پیٹر مے بنا جو میری "لیگ کٹر" گیند پر کاردار کی مدد سے کیچ آؤٹ ہو گیا اور کھیل کے دوران میں بمشکل ۲۶ رنز بنا پایا۔ ۲۳ رنز بنانے کے بعد کچھ اسی قسم کا حشر کامپٹن کا ہونے والا تھا لیکن اس کی قسمت نے یاوری کی اور اس کی مضروبہ گیند خود میں نہ دبوچ سکا۔ اسی طرح اس کے چند ایک کیچ وزیر محمد اور ذوالفقار نے کھو دیئے اور کامپٹن

کافی دیر ڈٹا رہا لیکن مزید ۴۰ رنز کا اضافہ کرنے کے بعد وہ میرے سامنے زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکا اور اسے بھی گراؤنڈ کو الوداع کہتے ہی بن پڑی۔ اسی طرح جب پیٹر مے کے بدل میں گریونی آیا تو وہ سخت اُلجھن میں گرفتار تھا اور اُسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ مدافعت کے لئے کونسا حربہ اختیار کرے۔ اس نے گیند کو ہٹ لگانے کی ہر ممکن سعی کی لیکن گیند اور بیٹ ہر بار تشنۂ ملاقات رہتے اور چاروناچار اُسے پھر اگلے موقعے کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کہ میری ایک گیند اس کے بیٹ کو چھوتی ہوئی سلپس کی طرف بھاگی جہاں حنیف محمد نے اُسے گرفت میں لے لیا اور گریونی کو بھی مبلغ ایک عدد رن کے عوض طوعاً و کرہاً میدان چھوڑنا پڑا۔

پیٹر مے اور کامپٹن کے بعد درحقیقت انگلستانی بیٹنگ کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس دن انہی دو کھلاڑیوں نے قدرے ہمت کی اور انگلستان کے اسکور کو پاکستان اسکور کے لگ بھگ کر دیا ورنہ گریونی کی بہت بُری طرح ناکامی کے بعد کم و بیش اسی قسم کے انجام سے بقیہ کھلاڑیوں کو دوچار ہونا پڑا اور اُن میں سے کوئی بھی قابلِ ذکر کھیل کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ انگلستانی اننگز کے اختتام تک ایونز، مکانن اور سٹیدھم کو محمود حسین نے ٹھکانے لگا دیا اور وارڈل اور



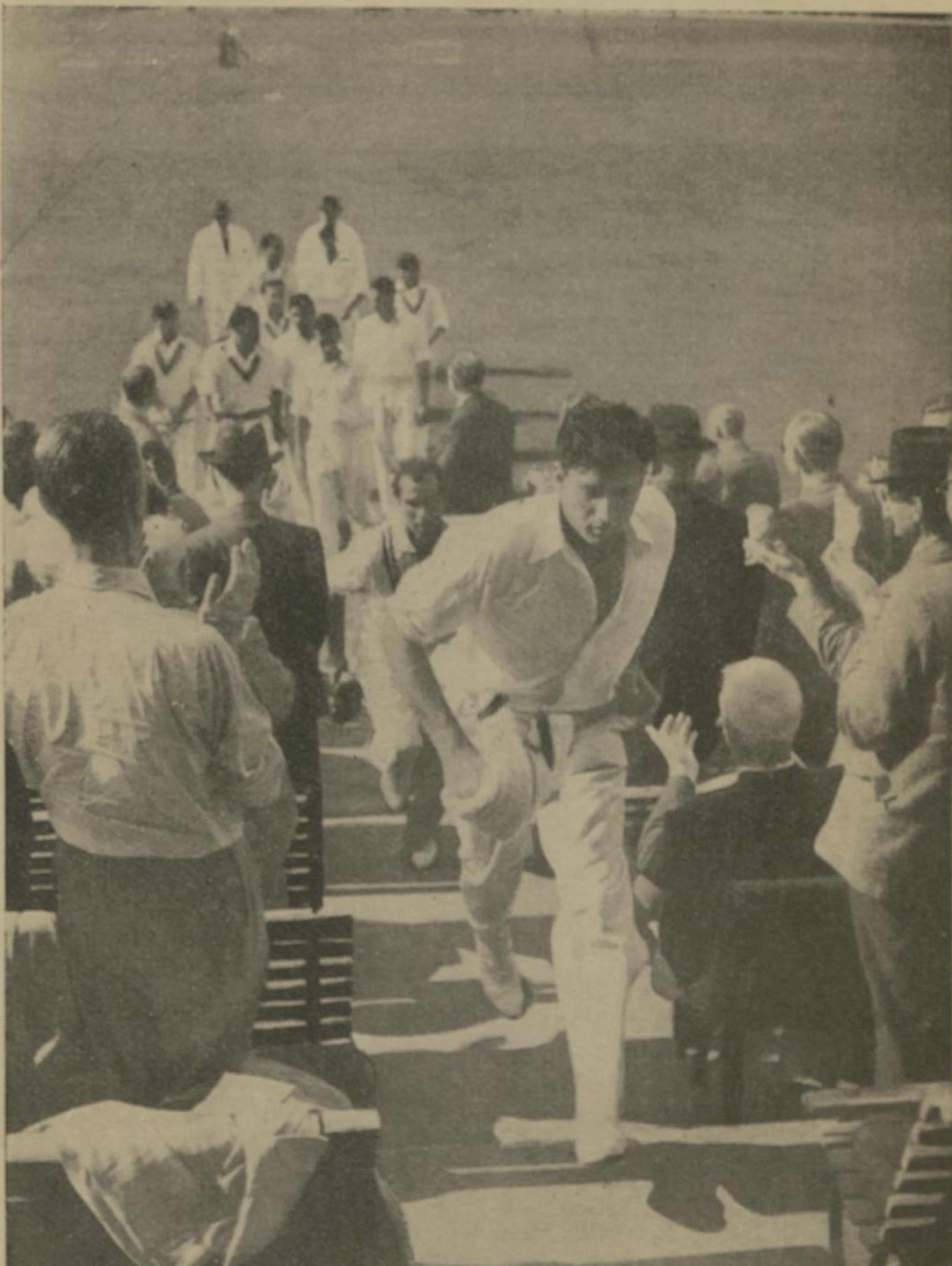
اوول ٹیسٹ میچ میں انگلستان کی پہلی انگ میں فضل محمود کی گیند پر حنیف محمد نے ٹام گریونی کا کیچ سلپ میں پکڑ لیا

ٹائسن کو آرام گاہ کا رخ میں نے دکھادیا نتیجتہً انگلستان کی مشاق ٹیم فقط ۱۳۰ رنز بنا کر آؤٹ ہوگئی اور ہم نے شکر کا کلمہ پڑھا کہ چاہے تین کی کمی سہی بہرحال مخالف ٹیم کا اسکور پاکستان اسکور سے بھی کم رہا۔ میں اس دن ساڑھے تین گھنٹے متواتر گیند اندازی کرتا رہا اور اس دوران میں ۳۰ اوور پھینک کر ۵۳ رنز کے عوض چھ وکٹیں حاصل کیں۔ میں اس دن خوشی سے پھولا نہ سمارہا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے اپنا فرض غیر معمولی کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ اور دوسرے لین ہٹن، کامپٹن، پیٹر مے اور گریونی ایسے بین الاقوامی شہرت کے مالک کھلاڑیوں کو شکست دی، جن کی فنی عظمت کی دنیا معترف ہے۔

انگلستان اپنی قوت آزما چکا تو پاکستان نے دوسری اننگز شروع کی اور حنیف اور شجاع کو میدانِ کارزار میں بھیجا مگر وارڈل نے انہیں خاطر خواہ اسکور بنانے کی مہلت نہ دی اور دونوں کھلاڑی بالترتیب ۱۹ اور ۱۲ رنز بنا کر واپس چلے آئے۔ ان کے بعد وقار حسن کی آزمائش تھی۔ لیکن وہ بیچارا بھی پاکستان اسکور میں ۹ رنز سے زائد کا اضافہ نہ

کر سکا۔ اور رن آؤٹ ہو گیا چنانچہ مقصود کو آگے بڑھایا گیا مگر اس نے انتہائی غیر ذمے دارانہ کھیل کا مظاہرہ کیا جو ٹسٹ میں کسی صورت بھی جائز نہیں اور پھر ایسے کڑے وقت میں جب پاکستان کی قسمت کا آخری فیصلہ ہو رہا تھا۔ اس نے دفاعی کھیل کھیلنے کی بجائے ہر گیند کو ہٹ لگانے کی کوشش شروع کر دی جیسے لیگ کرکٹ میں کھیل رہا ہو۔ اس کی اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکانن نے گیند پھینک کر وارڈل کے ہاتھوں کیچ کرا لی اور مقصود کو فقط ۴ رنز کے عوض کریز چھوڑنی پڑی۔ الغرض کاردار بذاتِ خود امتیاز کے ہمراہ گئے اور شام تک کھیلتے رہے۔

اگلے روز یعنی ۱۶ اگست کو امتیاز اور کاردار نے کھیل کا آغاز کیا۔ وکٹ اب بیٹسمین کی طرفدار تھی لہٰذا پاکستان کی بیٹنگ کا انحصار زیادہ تر امتیاز، کاردار، علیم الدین اور وزیر محمد پہ تھا کہ وہ پاکستان کو محفوظ پوزیشن میں لے جانے کے لئے اسکور میں نہایت سرعت سے اضافہ کئے جائیں لیکن خلاف توقع وزیر محمد کے سوا اول الذکر تینوں کھلاڑی کوئی خاص کارآمد ثابت نہ ہوئے اور بالترتیب ۱۲، ۷، اور صفر رنز بنا کر ٹائسن اور وارڈل کے ہاتھوں پسپا ہو کر واپس پویلین میں چلے آئے۔ پاکستان کرکٹ اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ہمارے آٹھ کھلاڑی بیکار کیے جا چکے تھے اور کل اسکور صرف ۲۰۸ کے ہندسے تک پہنچ سکا تھا۔ وکٹ اب بیٹسمین کی طرفدار تھی۔



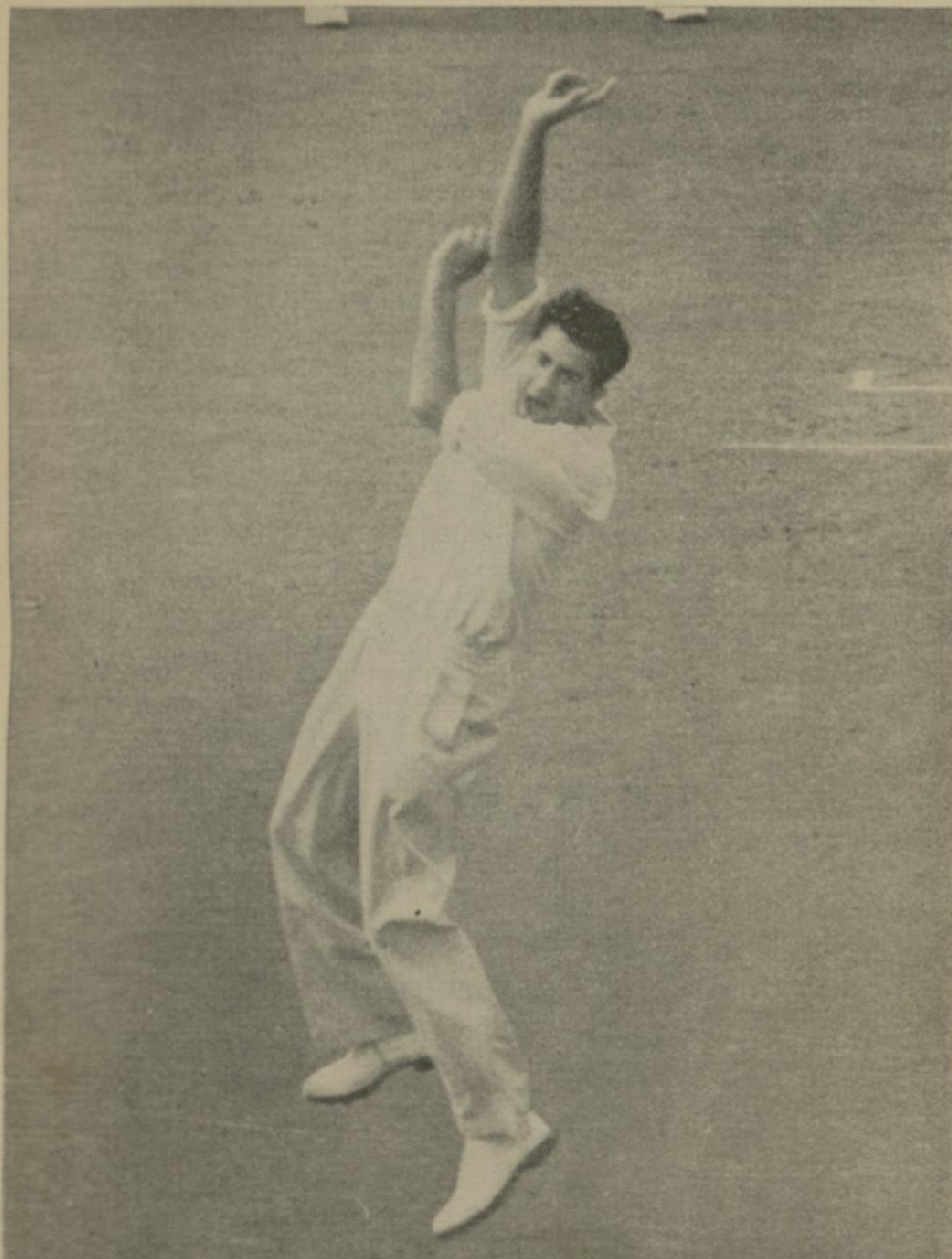
اوول ٹیسٹ میچ میں برطانوی ٹیم کو پہلی اننگ میں آؤٹ کرنے کے بعد تکان
سے چور فضل محمود ٹیم کی پیشوائی کرتے ہوئے پویلین میں داخل ہو رہے ہیں

ہماری نظر اب وزیر محمد اور ذوالفقار پر تھی اور ان دونوں نے واقعی بہترین کھیل کی نمائش کی۔ اور ٹوٹل اسکور کو ۲۰۰ تک لے گئے جس میں سے ۴۳ رنز کی مدد ذوالفقار نے بہم پہنچائی اور وارڈل کی گیند پر مے کے ذریعے کیچ آؤٹ ہو گیا۔ ذوالفقار کے بعد میں اور محمود حسین بھی صرف چھ چھ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ ہاں البتہ وزیر محمد اننگز کے اختتام تک "ناٹ آؤٹ" رہا۔ اس نے ۴۲ رنز بنائیں اور اس کا انفرادی اسکور سب سے زیادہ تھا۔ الغرض پاکستان کی کل ٹیم ۱۶۴ رنز کے حصول کے بعد انگلستان کے لئے میدان خالی کر گئی۔ اگرچہ ہماری دونوں اننگز کا اسکور ۱۶۷ تھا لیکن پھر بھی یہ کوئی ایسی کامیابی نہ تھی جس پر ٹیسٹ میچ میں بھروسہ کیا جائے۔ لہٰذا اب کی بار پھر ساری ذمے داری پاکستان باؤلرز کے شانوں پر تھی کہ وہ میدان مار لیں یا چھوڑ دیں۔ چائے کے وقت میں کوئی بیس منٹ باقی تھے جب ہٹن اور سمپسن نے بیٹ سنبھالے اور گراؤنڈ میں پہنچ کر انگلستان کی دوسری اننگز کا آغاز کیا۔ میرے سامنے اس مرتبہ بھی ہٹن تھا۔ اسے میدان میں دیکھتے ہی میرے ذہن میں یکدم نپولین کی ہالکنی رقص کرنے لگی جو فاتح اوول کی پابوسی کا انتظار

کر رہی تھی اور جہاں پہنچنے کے لئے میں اور ہٹن دونوں ایک ساتھ جدّوجہد کر رہے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر اس کا لہراتا ہوا ہاتھ اُبھرنے لگا اور میں کچھ جذباتی سا ہو گیا۔ مجھے اس شے کا شدّت سے احساس ہونے لگا کہ میری ہر گیند مجھے منزل کے قریب بھی لے جا سکتی ہے اور دور بھی۔ میرے پاس اس وقت نئی گیند تھی لہٰذا پہلا اوور پھینکنے سے قبل میں نے پھر اپنی قوتیں جمع کیں اور بہت کچھ سوچ کر ہٹن کو پہلی گیند پھینکی۔ گیند وکٹ سے ٹکرا کر بلند ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وکٹ صرف بیٹسمین کی اعانت پر آمادہ ہے اور ایسی وکٹ سے مدد لینے کے لئے کچھ زیادہ ہی زور لگانا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے نئی گیند ہونے کے باوجود نہایت ہوشیاری اور کامیابی سے ہٹن کو "ان سونگر" پھینکنی شروع کیں اور جب ہٹن کھیل میں اچھی طرح منہمک ہو چکا تو میں نے تیسرے اوور میں ایک "آؤٹ سونگر" پھینک دی۔ ہٹن اسے بڑھ کر کھیلنے لگا تو گیند اس کے بیٹ کو چھوتی ہوئی امتیاز کی ہتھیلیوں میں جا پناہ گزیں ہوئی۔ میں نے شدّتِ جذبات کے عالم میں امپائر کی طرف دیکھتے ہوئے چلا کر اپیل کی اور امپائر نے ہٹن کو آؤٹ کہہ کر انگلستانی



اوول ٹیسٹ میچ میں انگلستان کی دُوسری اننگ میں فضل محمود کی گیند پر امتیاز احمد نے کپتان ہٹن کا کیچ پکڑ لیا
تمام کھلاڑی اپیل کر رہے ہیں۔ ہٹن سرنگوں ہے۔



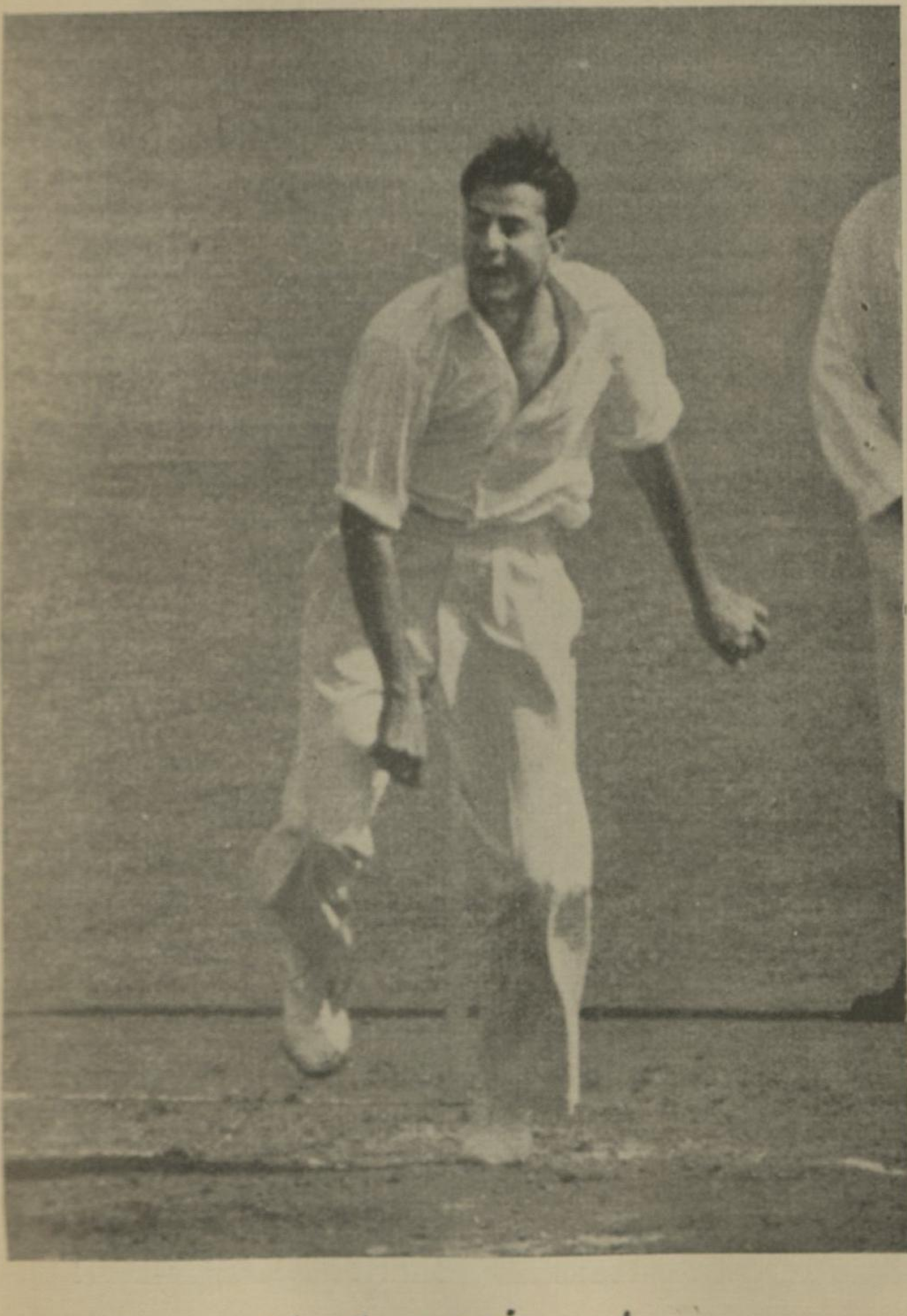
کپتان ہٹن اوٹ قرار دیئے جانے کیلئے فضل محمود ایمپائر سے چلا کر اپیل
کر رہے ہیں

بیٹنگ کی قوت کافی کمزور کر دی کیونکہ ہٹن ابھی تک فقط ۴ رنز بنا پایا تھا۔ ہٹن کی ناکامی پر پیٹر مے نے اس کی جگہ سنبھالی اور سمپسن کے اشتراک میں جم کر کھیلنا شروع کر دیا۔ اتنے میں چائے کا وقت ہو گیا اور ہم سب پویلین میں چلے گئے۔ چائے سے فارغ ہو کر میں نے بوٹوں میں ربڑ کی ایڑی دے دی تاکہ تیزی سے دوڑتے وقت میری ٹانگ کے اعصاب پر پھر برا اثر نہ پڑے اور آخری لمحات میں کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ چنانچہ میں ہر طرح سے تیار ہو کر محمود حسین کے ہمراہ دوبارہ گراؤنڈ میں پہنچا اور گیند اندازی شروع کر دی۔ میں نے پندرہ اوور پھینکے لیکن سمپسن اور مے اپنی جگہ سے نہ ٹلے اور تیز رفتاری سے رنز بنانے لگے۔ بالآخر مجھے تبدیل کر کے میری بجائے شجاع الدین کو آزمایا گیا اور ان بالمقابل سمت یعنی شمالی جانب سے محمود حسین کو ہٹا کر ذوالفقار کا امتحان کیا گیا۔ سمپسن جب ۲۰ رنز بنا کر انگلستان کے کل اسکور کو ۶۶ تک پہنچا چکا تو شجاع الدین نے اسے کھیلنے سے محروم کر دیا۔ سمپسن کے بعد ہٹن نے کامپٹن کو میدان میں بھیجا اور اس نے مے کے ساتھ مل کر خوب سنبھل کر کھیلنا شروع کر دیا۔ اس وقت ان کے سامنے شجاع اور ذوالفقار باؤلنگ

کر رہے تھے۔ ان دونوں نے ہر امکانی کوشش کی لیکن مخالف کھلاڑی ٹس سے مس نہ ہوئے اور پل بھر کے لئے بھی دق نہ ہو سکے۔ وہ پے در پے رنز بنا رہے تھے اور ان کی بیٹنگ کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ اکیلے مے اور کامپٹن ہی کھیل کے اختتام سے پہلے ہمارے کل اسکور سے زائد رنز بنا کر گھروں کو چل دیں گے اور ہمارے لئے سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہ رہ جائے گا۔ اس دن کے کھیل کے خاتمے میں ۴۵ منٹ باقی رہ گئے اور وہ دونوں کھلاڑی بدستور ڈٹے رہے۔ اور مزید شدت سے کھیلنا شروع کر دیا۔ انگلستان کا ٹوٹل اسکور ۵۰۰ تک پہنچ چکا تھا اور پاکستان ٹیم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں نے یہ منظر دیکھا تو اٹھ کر کاردار کے پاس گیا اور درخواست کی کہ باؤلنگ کی اجازت مجھے دی جائے۔ کاردار میری رائے سے اتفاق کر گئے اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کو کہا تاکہ ذوالفقار ایک اوور پھینک لے اور اسے واپس بلا لیا جائے۔ اسی اثنا میں کاردار نے مشروبات منگوائے اور ہمارے تازہ دم ہونے تک انگلستان کا اسکور ۵۰۹ ہو گیا۔ چنانچہ میں ایک نئے عزم اور بے پناہ اعتماد کے ساتھ گراؤنڈ میں گیا اور شمالی کنارے سے پیڑ مے کو گیندیں پھینکنا شروع کر دیں۔ مجھے



اوول ٹیسٹ میچ میں فضل محمود کا بولنگ ایکشن — کوڈرے بیٹ لیے منتظر کھڑا ہے۔



اوول ٹیسٹ میچ میں فضل محمود کا بولنگ ایکشن

اس وقت شکست کے آثار دکھائی دے رہے تھے لیکن میں نے گھبرانے کی بجائے حوصلہ بلند کیا اور پوری قوت سے کام لے کر کھیل میں شدت پیدا کر لی۔ میں نے اپنے پہلے ہی اوور میں پیڑمے کو ایک "لیگ کٹر" بھیجی جسے اُس نے ہٹ لگا کر کاردار کے ہاتھوں میں پہنچا دیا اور اُسے ۵۴ رنز کے عوض میدان چھوڑنا پڑا۔ ایٹن نے پاکستانی باؤلرز کے ردّ و بدل سے اپنے کھلاڑیوں کی بھی ترتیب بدل دی اور اس نے پیڑمے کے بعد گریونی کی بجائے ایونز کو بھیج دیا۔

ہماری طرف سے اب شجاع الدین کی باری تھی لہٰذا اس نے دوسری طرف سے کامپٹن کے ساتھ زور آزمائی شروع کی اور ہماری بدقسمتی کہ کامپٹن نے اور چھ رنز بنا کر کل اسکور ۱۱۵ کر دیا۔ چنانچہ میں نے پھر گیند سنبھالی اور دوسرا اوور ایونز کو پھینکنا شروع کیا جو وکٹ کیپری کے علاوہ کراری بیٹنگ کرنی بھی جانتا ہے۔ میں اس وقت انتہائی جوش میں تھا اور لحظہ بہ لحظہ شدت اختیار کرتا جاتا تھا۔ میں نے پوری دوڑ لگا کر ایک "لیگ کٹر" اس کی "لیگ سٹمپ" سے باہر کو پھینکی۔ گیند وکٹ سے ٹکرا کر تیزی سے گھومتی ہوئی اس کی "آف سٹمپ" کو جا لگی اور ایونز

بھی کھیلنے کی حسرت دل میں لیئے صرف ۳ رنز بنانے کے بعد کریز چھوڑ گیا۔ الیونز کی ناکامی پہ گریوئی میدان میں آکھڑا ہوا اور دوسری سمت سے شجاع الدین نے کامپٹن کو کھلانا شروع کیا۔ کامپٹن نے موقع پاکر ایک رن بنائی اور شجاع الدین کے سامنے گریوئی جا کھڑا ہوا۔ شجاع نے گریوئی کی بُری طرح خبر لی اور وہ ایل۔بی۔ڈبلیو کے باعث ایک بھی رن بنانے کا مزہ نہ چکھ سکا۔ گریوئی کا خلا پر کرنے کے لئے وارڈل آیا جو گیند کو بار بار چوٹیں لگانے کا عادی ہے اور اس کا نشانہ اگر ٹھیک بیٹھ جائے پھر تو بات ہی دیگر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وارڈل کا بیٹ بھولے سے بھی گیند کو چھُوئے تو گیند باؤنڈری لائن تک جا پہنچتی ہے۔

کھیل کا وقت پورا ہونے میں اب فقط دس منٹ رہ گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ کامپٹن اور وارڈل اب وقت کٹی کی کوشش میں زور دار بیٹنگ سے ہاتھ اٹھا کر صرف دفاعی کھیل پہ اکتفا کریں گے۔ لہذا میں نے کاردار سے کہا کہ وہ تمام فیلڈروں کو ہردو بیٹسمینوں کے سر پہ لا کھڑا کریں اور ان کے گرد ایک مضبوط گھیرا ڈال دیں تاکہ اگر وہ آہستگی کے ساتھ بھی کھیلیں تو جب بھی کیچ کرنے کا موقع مل جائے۔ کاردار نے جملہ



اوول ٹیسٹ میچ میں انگلستان کی دُوسری اننگ میں فضل محمود کی گیند پر امتیاز احمد نے کاؤڈری کا کیچ پکڑ لیا۔

انتظامات مکمل کرئے تومیں نے پھر ایک حوصلہ افزا پیشگوئی کی اور کہا کہ
اگر میں اس نزع کے وقت میں کامپٹن کو آؤٹ کر لوں تو جیت یقیناً
ہمارے قدموں میں ہے۔ چنانچہ میں نے ایک مصمم ارادے کے ساتھ
باؤلنگ شروع کی جب میں نے دوسری گیند پھینکی تو کامپٹن اسے پیٹنے
کے لئے آگے بڑھا لیکن گیند بیٹ کے کندھے سے کندھا بھڑاتی امتیاز
کے ہاتھوں میں چلی گئی اور دوسرے لمحے اوول کی گراؤنڈ اپیل کے فلک بوس
نعرے سے گونجنے لگی۔ کیونکہ اپیل کرنے والوں میں کھلاڑیوں کے علاوہ
پاکستان اسٹینڈ اور بالکنی میں بیٹھے سید فدا حسن اور جسٹس کارنیلیس مع دیگر
ممبران بھی شامل تھے۔ اپیل کی آواز مدھم ہوتے تک امپائر نے انگلیوں
سے اشارہ کیا اور کامپٹن ۲۹ رنز کے صلے میں اپنی جگہ ٹائیسن کے لئے خالی
کرگیا۔ کامپٹن کے آؤٹ ہونے پر تیس ہزار تماشائیوں کے جم غفیر پہ سکتے
کا عالم طاری تھا اور اس گھڑی ایک شخص بھی نتیجے کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکتا
تھا اس وقت تک انگلستان کے چھ کھلاڑی آؤٹ ہوچکے تھے اور ٹوٹل
اسکور صرف ۱۰۲ تک پہنچ سکا تھا۔ القصہ میں نے ٹائیسن کی آمد پر کاردار
سے کہہ کر اس کے گرد فیلڈر جمع کرائے اور سب کو اتنے نزدیک کھڑا

کیا کہ اگر وہ بیٹ کو ذرا لمبے ہاتھ سے گھماتا تو بیٹ فیلڈر کا سر پھوڑ دیتا۔ چنانچہ اس بے چارے نے محض گیندوں کی روک تھام جاری رکھی اور ایک بھی ہٹ نہ لگائی۔ بائنس کی اتنی احتیاط کے باوجود ایک "لیگ کٹر" اس کی نظر بچا کر پیڈ کو جا لگی اور دوسرے لمحے ایک گرجدار اپیل ہوئی۔ لیکن امپائر نے اُسے ایل۔ بی۔ ڈبلیو قرار دینے سے انکار کر دیا۔ ناچار شجاع الدین نے دوسری طرف سے وارڈل کو کھلانا شروع کیا اور جب انگلستان کا کل اسکور ۱۲۳ ہو چکا تو کھیل کا وقت ختم ہو گیا۔

شام کو میدان سے رخصت ہوتے وقت ہماری ٹیم کے افراد اور چار پانچ ہزار پاکستانی تماشائیوں کے چہروں پر غیر معمولی بشاشت تھی کیونکہ انہیں اب جیت کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ ان سب کی دعا تھی کہ انجام کار پاکستان ہی میچ جیتے۔ بہر کیف وثوق کے ساتھ پھر بھی کچھ نہ کہا جا سکتا تھا کہ نتیجہ کس ملک کے حق میں نکلے گا کیونکہ انگلستان کو کامیاب ہونے کے لئے صرف ۴۴ رنز درکار تھیں اور پاکستان کے ذمے اس کے بقیہ چار کھلاڑی ناکام بنانے تھے۔ انگریز قوم کی امیدیں وارڈل سے



اوول ٹیسٹ میچ میں فضل محمود کی گیند ٹائیسن کے پیڈ کو لگی۔ سب کھلاڑیوں نے اپیل کی مگر امپائر نے
ایل بی۔ ڈبلیو قرار نہ دیا۔

وابستہ تھیں اور پاکستانیوں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ غرضیکہ پلڑہ دونوں ٹیموں کا برابر تھا اور فتح کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہ کی جاسکتی تھی۔ میں بھی گراؤنڈ سے لے کر ہوٹل تک لگاتار سوچتا رہا اور جلدی سے کھانا کھا کر کمرے میں چلا گیا۔ مجھ پر اس وقت اضطراری کیفیت طاری تھی اور کسی کل چین نہ پڑتا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے اور دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہی تشویش لاحق ہو رہی تھی کہ ہمیں شکست دینے کے لئے انگلستان کو فقط ۱۴۹ رنز بنانی ہیں اور اس کے ابھی چار کھلاڑی باقی ہیں۔ اگر میں چاروں کھلاڑی پسپا نہ کرسکا اور پاکستان ہار گیا تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے اس فکر سے تنگ آکر سونے کی لاکھ سعی کی۔ مگر سب بے سود۔ نیند نہ آنی تھی نہ آئی میں کافی رات گئے تک جاگتا رہا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات گردش کرتے رہے بالآخر میں نے عاجز آکر تدبیریں لڑانی شروع کردیں کہ اگلے روز انگلستان کے ماندہ کھلاڑیوں کو کیونکر آؤٹ کرنا ہے۔ سب سے پہلے مجھے وارڈل کا خیال آیا جو "چپ دست" کھلاڑی ہے اور ہر اس گیند کی دھجیاں اڑا دیتا ہے جو اس کے قریب سے گزرے۔ حتیٰ کہ جو

گیند گڈ لینگتھ سے پیچھے گرے وہ اسے باؤنڈری لگائے بغیر دم نہیں لیتا۔ ٹامُسن بھی بُرا کھلاڑی نہیں۔ میں نے سوچا ـــــ ہو سکتا ہے لوڈر بھی رنز بنا جائے ـــــ میرے دل نے گواہی دی اور پھر میں مکانن کے متعلق غور کرنے لگ گیا کہ وہ کل کھیلنے کے قابل ہو گا یا نہیں کیونکہ اسے فیلڈ کرتے وقت انگلی پر خاصی چوٹ لگ گئی تھی ـــــ میرا دماغ بہت دیر خیالات کے دھارے پر بہتا رہا اور نصف شب کے بعد نہ جانے میں کب نیند کی آغوش میں ہلکورے لینے لگا۔

صبح گراؤنڈ جانے کے لئے کمرے سے نیچے اترا تو ٹیم کے دیگر افراد بھی غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ امتحان کا آخری دن تھا اور ہر ایک کی کارکردگی کا نتیجہ منظرِ عام پر آنے والا تھا۔ بہر حال ہم اسی کیفیت میں ٹیکسیوں کے ذریعے گراؤنڈ پہنچے۔ میچ دیکھنے کے لئے صرف ۵۰۰۰ تماشائی موجود تھے اور ان میں سے بھی اکثریت بھارت اور پاکستان کے باشندوں کی تھی جن کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں۔ تماشائیوں کی تعداد میں کمی کا سبب صرف یہ تھا کہ کھیل بظاہر نصف گھنٹہ



اوول کے آخری ٹیسٹ میچ کی دوسری اننگ میں کپتان ہٹن صرف ۲ رنز بنا کر
آؤٹ ہوئے۔ شکست کے آثار چہرہ پر ظاہر ہیں۔

سے زیادہ وقفے کا نہ تھا۔ بہرکیف ہم گراؤنڈ میں فیلڈنگ کے لئے نکلے اور محمود حسین نے وارڈل کو پہلا اوور پھینکا۔ وارڈل نے اس دوران میں دو رنز بنالیں اور میں شمالی جانب سے ٹائیسن کی طرف متوجہ ہوا۔ میں اپنی دوڑ کے پوائنٹ پر جا کھڑا ہوا اور لغورا اپنے فیلڈروں کا جائزہ لیا کہ آیا سب کے سب صحیح مقامات پر کھڑے ہیں۔ پھر میں نے ایک پچھلی سی نگاہ وکٹ اور بیٹسمین پر ڈالی اور میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ تیز ہے —— مجھے یکایک گذشتہ رات کے اندیشے یاد آ گئے اور میں سوچنے لگا کہ اگر بیٹسمین نے میری باؤلنگ کے دوران میں باقی رنز بنالیں تو نہ صرف پاکستان ٹیم کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ انفرادی طور پر میری ساکھ کو بھی سخت دھکا لگے گا —— چنانچہ میں نے قوتِ ارادی کو مضبوط کیا اور پہلی گیند پھینکنے کے لئے تیزی سے دوڑا۔ گیند ہاتھ سے چھوٹ کر عین اس نقطے پر گری جہاں میں نے پھینکنا چاہی تھی۔ پہلی گیند پھینکنے کے بعد مجھے خود پہ مکمل اعتماد ہو گیا اور میں نے اپنی باؤلنگ پر اس قدر قابو پالیا کہ اگر اس وقت کوئی وکٹ کے کسی حصے پر ایک سوئی بھی

رکھ دیتا تو میں بلا مبالغہ اس کا نشانہ کر لیتا۔ چنانچہ میں نے پہلا اوور میڈن کیا اور دوسری طرف سے محمود حسین پھر وارڈل سے جُٹ گیا۔ محمود حسین نے تیسری گیند پھینکی تو وارڈل "سلپس" کی طرف کھیلا جہاں علیم الدین فیلڈ کر رہا تھا لیکن شومئی قسمت سے علیم نے کیچ گرا دیا۔ ایسے کڑے وقت میں ایک عدد کیچ کا ضائع چلے جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ علیم خود اس حادثے کی تاب نہ لا سکا اور اس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور حوصلہ بلند کرنے کو کہا تاکہ وہ دل برداشتہ ہو کر کہیں بقیہ کیچ بھی نہ کھو دے۔ علیم کو مطمئن کر کے میں ٹائیسن کے گرد ہو گیا۔ وکٹ بیٹسمین کے لئے انتہائی مفید تھی اور باؤلر کو رتی برابر مدد نہ دے رہی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی باؤلنگ ایکشن میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر کے ٹائیسن کو "لیگ کٹر" پھینکی۔ ٹائیسن نے جلدی سے قدم بڑھا کر بیٹ سے گیند روکنا چاہی مگر گیند بیٹ سے ٹکرا کر امتیاز کے ہاتھوں میں چلی گئی اور دوسرے لمحے ایک زبردست اپیل ہوئی۔ امپائر نے ٹائیسن کو آؤٹ قرار دیا اور وہ بھی ایونز کی طرح فقط ۳ رنز کے عوض میدان خالی کر گیا۔ اس وقت انگلستان کا کل اسکور



اوول ٹیسٹ میچ میں فضل محمود کی گیند پر امتیاز احمد نے ٹامسن کا کیچ پکڑ لیا۔ ایمپائر نے بیٹسمین کو آؤٹ قرار دیا

۱۳۱ تھا اور اس کے ۷ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔

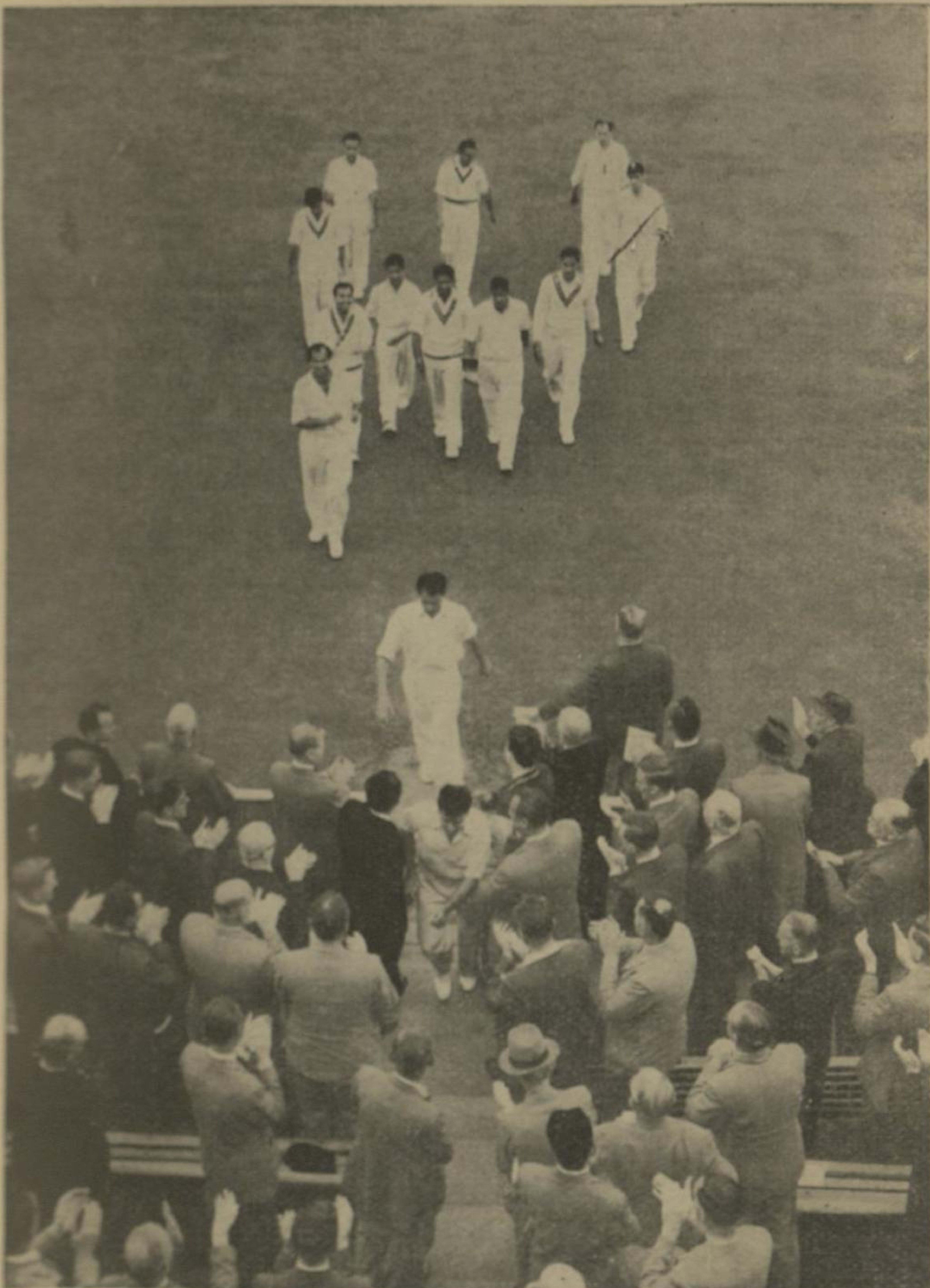
ٹامپسن کی جگہ لوڈر کھیلنے کے لئے آیا۔ اس گھڑی دونوں ٹیموں کے افراد پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ انگلستان کے کھلاڑیوں کی حالت کچھ زیادہ ہی نازک تھی اور وہ شکست کو قریب دیکھ کر بوکھلائے ہوئے تھے۔ لوڈر کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ میں نے پہلی گیند عین وکٹ کی سیدھ میں پھینکی لیکن اسے یوں معلوم ہوا جیسے گیند کا رخ وکٹ کی بیرونی جانب ہے چنانچہ اس نے اسی مغالطے میں گیند کو چھوڑ دیا اور گیند وکٹ کے اوپر سے تیرتی ہوئی یونہی گزر گئی۔ مجھے وار خالی جاتا دیکھ کر دکھ تو بہت ہوا مگر صبر شکر کر کے چپ ہو رہا اور دوسری گیند پھینکی۔ گیند کا لوڈر کے پاس پہنچنا تھا کہ اس نے ایک وحشیانہ ہٹ لگائی اور جھٹ سے چار رنز بنا لیں۔ میں اس خلافِ توقع ردِ عمل کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے پاکستان اسٹینڈ کی طرف نظر دوڑائی۔ تمام تماشائی مضطرب بے چین نظر آ رہے تھے حتیٰ کہ بعض خواتین تسبیح پھیرنے میں مشغول تھیں اور پاکستان کی جیت کے لئے خدا سے دعا مانگ رہی تھیں۔ جب میں نے دوبارہ باؤلنگ

شروع کی اور "چپ وست" کھلاڑی وارڈل سے نمٹنے کے لئے بڑھا
تو ہر گیند پہ پاکستانی تماشائی بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوتے کہ شاید
بٹسمین اب آؤٹ ہوا کہ ہوا۔ ہر دو ٹیموں کے کھلاڑیوں پہ عجب
سی کیفیت طاری تھی۔ وارڈل ایسا سخت بٹسمین بھی گیند کو زوردار
ضربیں لگانے کی بجائے دب کر کھیل رہا تھا۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ
"لیگ کٹ" اس انداز سے کھیلی کہ گیند "فائن لیگ" کی طرف چلی گئی
شجاع الدین "شارٹ لیگ" پر فیلڈ کر رہا تھا میں نے نئے اوور کی ابتدا
سے پہلے کاردار سے اجازت لے کر شجاع الدین کو "فائن لیگ" کی
طرف تین قدم سرک جانے کے لئے کہا مجھے وارڈل کی آئندہ ہٹ
کے انداز کے متعلق اس قدر پختہ یقین تھا کہ میں نے شجاع کو پکا کرنے
کے لئے یہاں تک کہہ دیا کہ اس جگہ پر کوئی نشان لگا لو اور خواہ زمین
جنبش میں آ جائے مگر تم گل محمد کی طرح یہیں چپکے رہنا۔ شجاع کی طرف
سے مطمئن ہو کر میں نے گیند کو مضبوطی سے پکڑا اور پوری دوڑ لگا کر دیوانگی
کے عالم میں ایک "لیگ کٹر" سپرد فضا کر دی۔ اور میری خوشی کی
انتہا نہ رہی جب وارڈل اسے حسب توقع طریقے سے کھیلا اور گیند

نہایت آرام سے شجاع کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ وارڈل کا کیچ آؤٹ ہونا تھا کہ ہندو اور مسلمان تماشائی فرطِ مسرت سے چیخ اُٹھے۔ پاکستان کی جیت اب کوئی دم کی بات تھی —— انگلستان کی اُمید کا آخری چراغ بھی گل ہو چکا تھا —— ہٹن کے تمام اہم مہرے بیکار کیے جا چکے تھے —— "بین الاقوامی کرکٹ کے چھوکروں" نے اپنے استقلال اور جدّوجہد سے کرکٹ کے اب وجد کا منہ چڑا دیا تھا۔ انگلستان کے کھلاڑی وارڈل کی شکست اور اس منظر کی تاب نہ لا سکے اور اپنے ڈریسنگ روم کی بالکنی سے اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ وارڈل وزنہ بنا کر میدان سے چل دیا۔ تو اس کی جگہ مکانن کو بھیجا گیا جو انگلی پر زخم ہونے کے باوجود انگلستان کی شکست کو چند لمحوں تک ٹالنے کے لئے آگیا اور اس نے بھی دب کر کھیلنا شروع کیا۔ جذباتی ہیجان کے باعث اس کے چہرے پہ سخت گھبراہٹ تھی اور اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں —— میری اپنی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی فرق صرف فاتح و مفتوح کا تھا۔

وارڈل کے آؤٹ ہونے پر محمود حسین نے دوسری طرف سے

باؤلنگ شروع کی۔ اس کے سامنے لوڈر کھڑا تھا۔ لوڈر نے اس کی گیند کو ہٹ لگائی۔ گیند ہوا کے دوش پر تیرتی وقار کے نزدیک پہنچ گئی جس نے پھرتی سے گیند پوچ کر لوڈر کو کیچ آؤٹ کر دیا۔ پاکستان اسٹینڈ میں ایک ہلچل مچ گئی۔ بہی خواہوں کے سر فضا میں پھر بلند ہوئے اور تماشائی جوش سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انگلستان کے آخری کھلاڑی سٹیدھم کی پسپائی کا شدت سے انتظار کرنے لگے جو لوڈر کی جگہ سنبھالنے کے لئے گراؤنڈ میں پہنچ چکا تھا۔ سٹیدھم کریز پر آ کھڑا ہوا تو محمود حسین نے باؤلنگ شروع کی اور اپنے حریف کو پورے اوور میں صرف ۲ رنز بنانے کا موقع دیا۔ چنانچہ دوسرے کنارے سے میں مکانن کے درپے ہوا اور اپنے اوور کی ابتدا کی۔ مکانن کو میں پانچ گیندیں پھینک چکا لیکن اس اللہ کے بندے نے دفاعی کھیل سے ایک قدم ادھر نہ ہٹایا اور نہایت احتیاط سے کھیلتا رہا۔ مجھے اُس کے اِس رویّے سے سخت کوفت ہوئی اور میں بے کلی سی محسوس کرنے لگا۔ میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنے کے لئے بیقرار تھا۔ مجھے گراؤنڈ اور فاتح اوول کی منتظر بالکنی کے درمیان صرف مکانن حائل نظر آتا تھا



اوول ٹیسٹ میچ کی جیت کے بعد فضل محمود پاکستانی ٹیم کی پیشوائی کرتے ہوئے
پیویلین میں داخل ہو رہے ہیں ۔ تماشائی تالیاں بجا کر خیر مقدم کر رہے ہیں۔

جسے ہٹانے کے لئے میں نے چھٹی گیند پوری قوت سے پھینکی۔ مکانن بھی یا تو اپنے بے جان کھیل سے اُکتا گیا تھا یا پھر چراغِ صبح کی مانند خاموش ہونے سے پہلے اس نے بھی بھڑک دکھائی اور اوور کی آخری گیند کو آہستہ سے ہٹ لگا کر بڑی سُرعت سے ایک رن بنانے کی کوشش کی۔ گیند چوٹ کھاتے ہی فضا کا سینہ چیرتی ہوئی حُنیف کے نزدیک سے گذری اور اس نے نہایت پھرتی سے گیند "سٹمپس" میں دے ماری اور مکانن "رن آوٹ" ہو گیا۔ میں یہ منظر دیکھ کر دیوانوں کی طرح حنیف کی طرف لپکا اور جوشِ مسرّت سے اسے ہاتھوں میں اُٹھا کر ناچنا شروع کر دیا —— میرے جاگتے کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکے تھے —— میری آرزوئیں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں —— انگلستان ۲۴ رنز کی کمی سے شکست کھا گیا اور بین الاقوامی کرکٹ کے نقشے پر پاکستان کا نام بھی نمایاں حروف میں ابھر آیا —— پاکستان اسٹینڈ میں کھلبلی مچ گئی اور تماشائیوں پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی سب کے سب اچھل اچھل کر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ چند لمحے بعد میں ٹیم کی پیشوائی کرتا ہوا پیویلین کو چل دیا۔ ڈریسنگ روم میں پہنچتے ہی سیّد فدا حسن

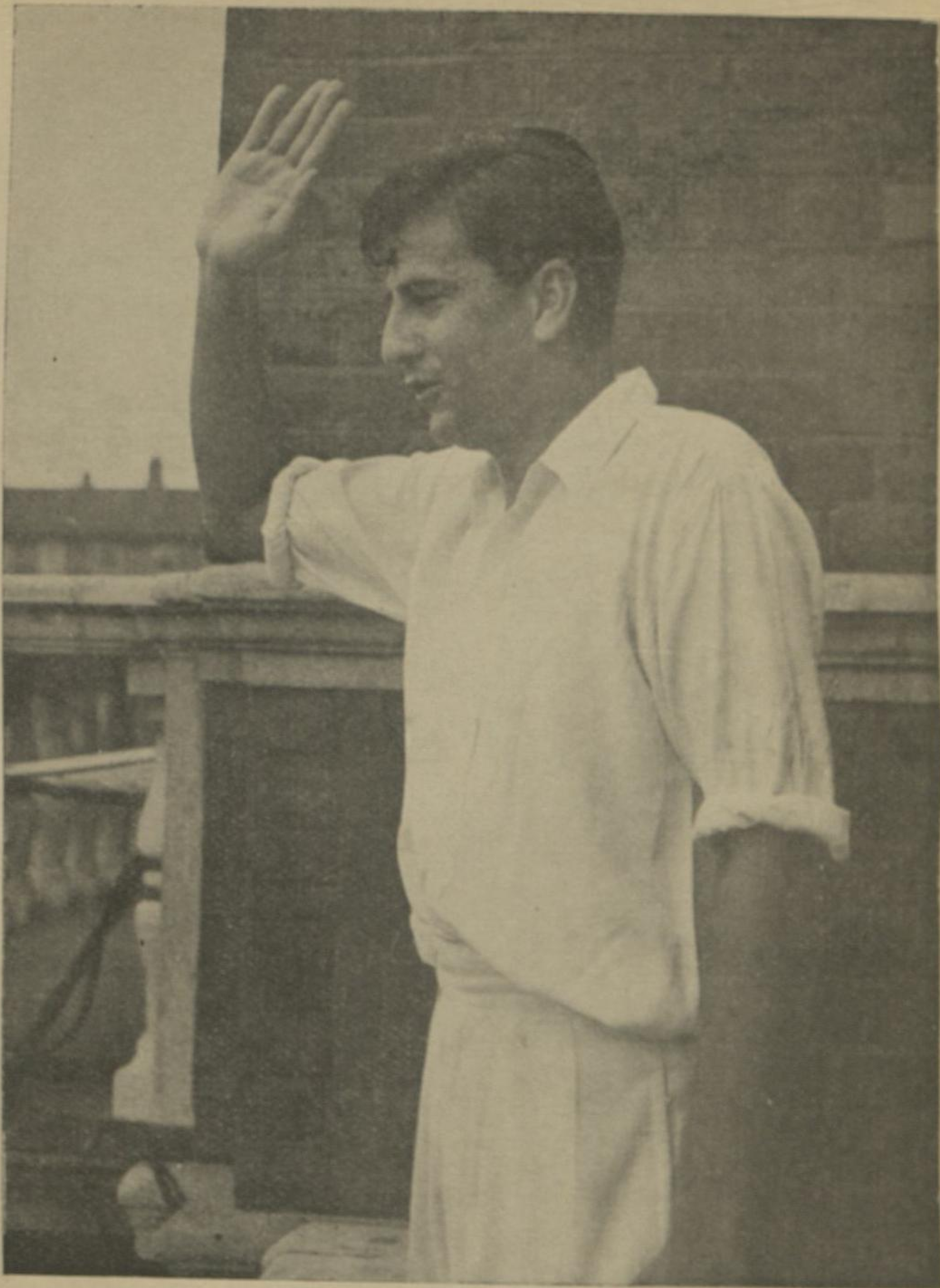
نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔ اتنے میں جنرل محمد ایوب خاں جنرل اعظم خاں جسٹس کارنیلیس اور میاں محمد سعید بھی باہر سے اُٹھ کر ڈریسنگ رُوم میں تشریف لے آئے اور سب نے خلوصِ دل سے مبارکباد دی۔ جسٹس کارنیلیس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ عالمِ وارفتگی میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ بلاؤ ماسٹر لین ہٹن اور کامپٹن کو تاکہ وہ آکر فضل محمود سے پوچھیں کہ کرکٹ کیسے کھیلی جاتی ہے ——

ڈریسنگ روم کے باہر اور بالکنی کے نیچے پاکستان زندہ باد اور نعرۂ حیدری کی بلند آوازیں گونج رہی تھیں اور تماشائی خوب زور سے چلا رہے تھے کہ فضل محمود کو بھیجو۔ چنانچہ میں بالکنی پر گیا اور ہاتھ کے اشارے سے تماشائیوں کا شکریہ ادا کیا۔ تماشائی

"Well Done Fazal Mahmood"

"Three Cheers Fazal Mahmood"

اور فضل محمود زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ میں اس وقت اسی مقام پر کھڑا تھا۔ جہاں گئے سال آسٹریلیا کو ہرا کر لین ہٹن کھڑا تماشائیوں سے خراجِ عقیدت وصول کر رہا تھا اور میں اس گھڑی تماشائی کی حیثیت



اِتفاقات ہیں زمانے کے

اوول ٹیسٹ میچ کی جیت کے بعد پویلین کی بالکنی پر کھڑے فضل محمود ہاتھ لہرا لہرا کر ہزارہا تماشائیوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں یہ وہی مقام ہے جہاں ایک سال قبل کپتان ہٹن نے آسٹریلوی ٹیم کو شکست دیکر عوام سے خراجِ تحسین حاصل کیا تھا۔

میں بیٹھا اسی بالکنی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔ وہ منظر یاد آتے ہی میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہو گئے۔ میں وہاں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا اور نیچے کھڑے ہجوم کا مکرر شکریہ ادا کر کے ڈریسنگ روم میں واپس چلا آیا —— میں نے اپنا پرانا لباس بڑی احتیاط اور احترام سے تبرک کے سنبھالا اور اس دن کے بعد میرا وہم یقین کامل میں بدل گیا ہے کہ جس روز بھی میں اپنی پتلون اور بوسیدہ بوٹ پہن کر میدان میں نکلوں گا میچ میں جیت یقیناً پاکستانی ٹیم کی ہو گی۔ میں نے لکھنؤ ٹسٹ بھی اسی لباس میں جیتا تھا اور ۹۲ رنز میں ۱۲ وکٹیں ہتھیائی تھیں اور اوول کے تاریخی میدان میں بھی ۹۹ رنز کے عوض ۱۲ وکٹیں حاصل کر لیں۔ اوول کی شاندار اور عظیم الشان فتح کے بعد میں جتنا عرصہ گراؤنڈ میں رہا وہ میری زندگی کے بہترین اور دل خوش کن لمحات تھے۔

میچ کے اختتام پر ہمارے اعزاز میں پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے ایک پُر تکلف عشائیہ ترتیب دیا گیا جس میں تین چار سو کے قریب

پاکستانی مہمان تھے جن کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔
گو ہائی کمشنر عزت مآب اصفہانی اس وقت پیرس میں مقیم تھے
تاہم بقیہ عملے نے ہماری عزت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا
دعوت میں پریس کے نمائندے اور ایک سو کے قریب فوٹوگرافر
بھی مدعو تھے جن کے کیمرے لحظہ بھر کے لئے بھی غافل نہ ہوئے حتیٰ
کہ سفارت خانے کی ملازم خاتون مس ستھیا بھی فلیش لائٹ کی زد
سے محفوظ نہ رہ سکی اور عین اس وقت جب کہ وہ جوشِ مسرت میں
اپنی تہذیب کے مطابق خاکسار کا بوسہ لے رہی تھی کسی ستم ظریف نے کیمرے کا
بٹن دبایا اور اس انوکھی مبارکباد کا نقش سلولائڈ کے فیتے پر منتقل
کر دیا۔

رات کو نو دس بجے کے قریب دعوت سے فارغ ہو کر
برنز ہوٹل پہنچے۔ وہاں بھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ پریس کے نمائندوں
کی نظر ہو گیا اور کافی رات گئے سونا نصیب ہوا۔ دوسرے
دن صبح پاکستان سے مبارکباد کی بے شمار تاریں موصول ہوئیں
اور یہ سلسلہ ایک دو دن جاری رہا۔ انگلستان کے پریس میں بھی



اوول ٹیسٹ میچ کی جیت کے بعد پبلک کے پُرزور اصرار پر فضل محمود ایک پاکستانی لڑکے کے ہمراہ دوبارہ پیویلین کی بالکنی میں —— انکے بائیں ہاتھ میں فخریہ طور پر اِس میچ کی ایک وکٹ ہے جو بطور یادگار انہیں ملی ہے۔

ہنگامہ بپا ہو گیا اور ان لوگوں نے بھی پاکستان ٹیم کے کھلاڑیوں کو دل کھول کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اوول کی جیت کے بعد پریس اور کرکٹ کے انگلستانی نقادوں کو بھی اپنی رائے بدلنی پڑی اور جن لوگوں نے دوسرے ٹسٹ میچ کے بعد یہ کہا تھا کہ پاکستان کرکٹ ٹیم فی الحال "ٹسٹ سٹیٹس" کے قابل نہیں اُنہیں اپنی کوتاہ بینی پر خود بخود پچھتانا پڑا۔ حتیٰ کہ "یارکشائر پوسٹ" کے ڈینل ہیکلپہ بھی نادم ہو کر معذرت خواہ ہوئے جنہوں نے دوسرے آزمائشی میچ کے وقت ازراہِ تمسخر لکھا تھا:-

"Two Cheers For Pakistan."

کیونکہ ان کے خیال میں پاکستان ٹیم میں فقط دو ہی کھلاڑی تھے ایک میں اور ایک حنیف۔

اوول ٹسٹ میچ میں جیت کو ممکن بنانے کے لئے میرے جسم کو غیر معمولی مشقت اٹھانی پڑی۔ میچ کے خاتمے پر میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور گیند کو گھما گھما کر داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلیاں

بُری طرح مجروح ہوگئی تھیں۔ مجھے فوری آرام کی بے حد ضرورت تھی۔ ورنہ کسی نہ کسی اعضا کا ناکارہ ہوجانا یقینی امر تھا اور ابھی میں نے واپس پاکستان پہنچ کر بھارتی کھلاڑیوں سے بھی قوت آزمائی کرنی تھی۔ لہٰذا میں نے کپتان کاردار سے رخصت کی درخواست کی جو انہوں نے فوراً مان لی اور میں سوائے "کینٹ میچ" کے اور کہیں نہ کھیلا۔ پاکستان ٹیم نے اوول کے بعد چھ میچوں میں حصّہ لیا جو بالترتیب کینیڈا اسیکس، کینٹ، مڈل سیکس، این انگلینڈ الیون اور ہیرسٹر الیون کے ساتھ کھیلے گئے جن میں سے پہلا ایک اننگز اور ۶۷ رنز سے جیتا گیا۔ دوسرا اور پانچواں برابر رہا۔ تیسرے اور چوتھے میں ۹ وکٹوں اور ۴۰ رنز سے کامیابی ہوئی اور چھٹا جو ۸، ۹، ۱۰ ستمبر کو اسکاربرو میں کھیلا گیا ۹ وکٹوں سے ہار دیا۔ اور ۱۰ ستمبر کو ہمارا دورہ انگلستان ختم ہوگیا۔

دورے میں میری ٹسٹ میچوں کی باؤلنگ اوسط اوّل رہی۔ میں نے ۱۶۷ اوور میں ۴۰۸ رنز کے عوض ۲۰ وکٹیں



نامور برطانوی کھلاڑی اور کرکٹ کے اُستاد ایلف گوورا اوول ٹیسٹ میچ کی جیت کے بعد فضل محمود کو مبارکباد
دیتے ہُوئے پُرجوش مصافحہ کر رہے ہیں۔

حاصل کیں اور اوسط ۲۰٫۴۰ رہی - میری کل دورے کی باؤلنگ اوسط بھی اوّل رہی - میں نے ۶۶۵ اوور پھینکے جن میں سے ۲۴۶ میڈن رہے اور مجھے ۱۳۵۰ رنز کے بدلے ۷۷ وکٹیں ملیں اور اوسط ۱۷٫۵۳ ہوئی - اس کے علاوہ اوول کے میدان میں میرے کھیل کی نمائش کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مجھے سیزن کا انڈو پاکستان کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا - اور اس کے صلے میں انگلستان کے انتخاب کنندگان نے مجھے "برل کریم میکرز" کی طرف سے ایک سو گنی اور ایک چاندی کا کپ پیش کیا - مزید برآں کرکٹرز کی کتاب وِزڈم میں بھی میرا نام سالِ رواں کے بہترین کھلاڑیوں کی فہرست میں شامل کیا گیا جس کا مجھے فخر ہے - اس کے علاوہ "پلے فیئر" کی طرف سے تشکیل کردہ "ورلڈ الیون" کے لئے بھی مجھے منتخب کر لیا گیا -

اسکاربو میں آخری میچ کھیل کر ہم برنز ہوٹل جا پہنچے اور پاکستان کو واپسی کی تاریخ کا شدت سے انتظار کرنے لگے

ہمیں وطن سے نکلے ہوئے خاصہ عرصہ ہو چکا تھا لہٰذا سبھی کھلاڑی اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے بیتاب تھے۔ چنانچہ مورخہ ۲۴ ستمبر کو ہم لندن سے بذریعہ ریل ساؤتھ ہمپٹن پہنچ گئے اور "بٹوری" جہاز میں بیٹھ کر سمندر کی لہروں پر بہتے ۱۱ اکتوبر کو ساحل کراچی پر اترے۔ بندرگاہ پر پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کے اراکین اور بہت سے تماشائیوں نے ہمارا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ میں چند دن کراچی میں مقیم رہا اور کوئی ہفتہ بھر بعد اپنے لاہور میں چلا آیا۔"

"بڑا ہی اچھا کیا جو اپنے لاہور میں چلے آئے۔" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کس لحاظ سے۔" فضل کرسی سے اٹھا اور انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔

"اس لحاظ سے کہ میری بھی خلاصی ہوئی۔" میں نے ٹیبل لیمپ کے شیڈ کا رخ پیڈ سے ہٹا کر اس کی جانب کر دیا اور مجھے یک دم اندھیرا ہو جانے سے احساس ہوا کہ شام کا وقت



اوول ٹیسٹ میچ کے اختتام پر بیشمار تماشائی فضل محمود کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں

ہو چکا ہے۔ "کیا بجا ہو گا؟" میں نے صحیح ٹائم معلوم کرنا چاہا۔

"تقریباً چھ" فضل نے رسٹ واچ دیکھ کر جواب دیا۔ گویا چار گھنٹے سے اس کمرے میں مقید ہیں۔" میں نے پیکٹ اٹھایا مگر سگریٹ ندارد۔ بھلا کُل چار پیکٹ اور وہ بھی بلا کے سگریٹ نوش آخر چالیس سگرٹ کہاں تک ساتھ دیتے۔ چھ منٹ میں ایک سگرٹ بھی کوئی بات ہے۔ "اردلی" فضل نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اردلی کو پکارا۔ "جی صاب" دوسرے لمحے اردلی اٹینشن کی حالت میں کھڑا تھا۔ "ایک پیکٹ گولڈ فلیک اور ایک سیٹ چائے" اس نے پتلون کی دائیں جیب سے بٹوا نکالا اور دس روپے کا ایک کڑکڑاتا نوٹ اردلی کے حوالے کر دیا۔ وہ سلوٹ مار کر کمرے سے باہر چلا گیا اور ہم پھر محوِ کلام ہو گئے اور جب تک چائے نہ آئی ہم باتوں میں مشغول رہے۔ دورانِ گفتگو میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا ادول کی جیت کے بعد بھی آپ خود کو فن کی انتہا تک پہنچا ہوا خیال کرتے ہیں یا ستاروں سے

آگے جہاں اور بھی ہیں والا معاملہ ہے۔ میرا یہ سوال سن کر فضل بالکل سنجیدہ ہوگیا جواب میں فیض کے الفاظ دہراتے ہوئے کہنے لگا: "طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی زوال نہیں۔ اس کا فن ایک مستقل کاوش ہے اور دائمی کوشش۔" چائے سے فارغ ہوکر فضل نے بوٹوں کے تسمے کس لئے اور چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ "ہاں جی" میں نے حسبِ معمول استفہامیہ لہجے میں پوچھا اور سگریٹ کا ایک طویل کش لے لیا۔ "کیا مطلب" وہ مجسم سوالیہ نشان بن گیا اور مارے دہشت کے کوٹ کا دوسرا بٹن بھی بند نہ کر سکا "ابھی آپ کو کچھ اور بھی پوچھنا ہے کیا؟" اس کی آواز گلوگیر تھی۔ "انڈو پاکستانی میچوں کے متعلق توقعات" میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ازراہ شرارت مسکرایا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا: "ٹیم بہاول پور کیمپ میں پہنچ چکی ہے اور انچارج "ڈیم فول" ابھی تک لاہور میں بیٹھا ہے" ——— وہ روہانسا گیا اور مجھے اس روز پتہ چلا کہ حضرت خود کو بھی



مس سلطے حسین اور مس نجمہ پاکستانی خواتین فضل محمود سے آٹوگراف لے رہی ہیں۔ پاس مشہور برطانوی کھلاڑی
ڈینس کومپٹن کھڑے ہیں۔

ڈیم فول کہنے سے نہیں چوکتے۔ معلوم ہوتا ہے آپ مجھے کل نہیں جانے دیں گے۔" اس نے میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا: "پندرہ منٹ سے زائد وقت نہیں لوں گا۔" میں نے اسے حوصلہ دلایا اور چار و ناچار اس نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے پھر بولنا شروع کر دیا: "ایک منٹ" میں نے لیمپ کی روشنی اپنی طرف کی "ہاں جی" کہنے کے بعد میری پنسل دوبارہ حرکت میں آ گئی: "بھارت اور پاکستان دونوں نے میچ کی تیاری میں جس گرمجوشی اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے پیش نظر کوئی بھی ذی فہم انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہر دو ملکوں کے کھلاڑی جان لڑا کر مقابلہ کریں گے اور یہ میچ بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اول کی جیت کے ہمہ گیر اثرات سے بھارت بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور اس نے پاکستان سے نبرد آزما ہونے کے لئے خود کو پہلے سے تیار کر رکھا ہے یعنی بھارت نے تقریباً تین ماہ بیشتر تیس بہترین کھلاڑیوں کا انتخاب کیا

اور انہیں ونو منکڈ کی زیر نگرانی ٹریننگ کے لئے پونہ بھیج دیا۔ تربیتی کیمپ کی میعاد پوری ہوئی تو ٹرائل میچ کھیلے گئے تاکہ چیدہ چیدہ کھلاڑیوں کو منتخب کیا جائے جو اعلیٰ کرکٹ کے معیار پہ پورے اُتریں۔ اس کے علاوہ عوام کے جذبات کا یہ عالم ہے کہ بھارت کا بچہ بچہ پاکستان کا دورہ کرنے والی ٹیم میں بے حد دلچسپی لے رہا ہے۔ یہاں تک کہ چند صاحبِ ثروت اصحاب نے بھارت کرکٹ کنٹرول بورڈ کو کھلاڑیوں کی تربیت پر صرف کرنے کے لئے لاکھوں روپے چندہ دیا ہے تاکہ بھارت کا کوئی کھلاڑی بھی فنی اعتبار سے ہیٹا نہ ہو اور بھارتی ٹیم ہر قیمت پر میچ جیت کر کرکٹ کے میدان میں پاکستان سے سبقت لے جائے۔ اس صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ بھارتی ٹیم اس مرتبہ سر دھڑ کی بازی لگا دے گی۔ اور میچ کافی ولولہ انگیز اور دلچسپ ہوں گے۔

کچھ اسی قسم کا اقدام پاکستان نے اٹھایا ہے اور

ہمارا کرکٹ کنٹرول بورڈ بھی تربیتی کیمپ کے نتائج کو مدِنظر رکھ کر کامیاب ترین کھلاڑیوں کو آگے بڑھائے گا۔

بھارتی ٹیم میں جن کھلاڑیوں کو شامل کیا گیا ہے ان کی اکثریت اپنے فن میں ماہر ہے اور سب کے سب ٹرف اور میٹنگ دونوں وکٹوں پر بخوبی کھیل سکتے ہیں۔

بھارت کی باؤلنگ کا انحصار زیادہ تر منکڈ، گپتے، پھڈکر، غلام احمد، جیو پٹیل، اور بھنڈارے پر ہے اور میرے خیال میں انہی باؤلروں سے کامیاب اور معیاری گیند اندازی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بیٹنگ کے لحاظ سے منکڈ، امریگر، پی رائے، مانجریکر، رام چند اور پھڈکر کے نام زیادہ معتبر ہیں۔ پاکستان ٹیم میں سے محمود حسین، خان محمد، شجاع اور ذوالفقار کے حملوں پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے بیٹنگ کے سلسلے میں حنیف، امتیاز، وقار، وزیر محمد اور شجاع کے نام قابلِ اعتماد ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارے دیگر بیٹسمین بھی کافی اچھی فارم میں ہیں۔ نیز ہمارے کھلاڑی بھی ٹرف

اور بیٹنگ ہر دو وکٹوں پہ بخوبی کھیل سکتے ہیں۔

دونوں ملکوں کی باہمی سیاسی کشمکش ان میچوں پر بھی یقیناً اثر انداز ہو گی اور میرے خیال میں اس سے کھیل کا لطف دوبالا ہو جائے گا کیونکہ ہر دو ٹیمیں میچ جیتنے کی انتہائی کوشش کریں گی۔ باقی رہا ہار جیت کا سوال تو جس ٹیم کے کھلاڑیوں میں زیادہ اہلیت اور قوتِ برداشت ہو گی وہ کامیابی حاصل کر لے گی۔ وقت سے پہلے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ دونوں ٹیمیں ایک سی مضبوط ہیں۔

قطع نظر اور باتوں کے ان میچوں سے اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ دونوں ملکوں کے عوام میں کرکٹ کا رجحان اور زیادہ فروغ پائے گا جس کے باعث بہت سے بہتر کرکٹر پیدا ہونے کے امکان روشن ہو جائیں گے۔"

"بس جی" فضل نے نکٹائی کی گرہ درست کی اور بغیر کچھ پوچھے گیچھے باہر چل دیا۔ میں نے بھی پیڈ کو فائل میں جلدی سے لپیٹ اس کے پیچھے ہو لیا۔ شام کے سات بج چکے

تھے اور باہر کافی اندھیرا ہونے کے علاوہ خاصی سردی بھی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے بتی جلائی اور میں کوٹ کے کالر اوپر اُٹھا پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

موٹر سائیکل نہایت تیزی سے اقبال روڈ کو عبور کر رہی تھی اور میں اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا کہ واقعی تاریخ کے یادگار واقعات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی پشت پر متعدد دانشوروں کی پیہم مساعی اور سالہا سال کی انتھک جدوجہد کا ہاتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اوول میں پاکستان کی جیت یقیناً ہر پاکستانی کے لئے سرمایۂ افتخار ہے لیکن کون جانتا ہے کہ ڈرامے کے اصل ہیرو کو اس مقام تک پہنچنے کے لئے کیا کیا مراحل طے کرنے پڑے ہیں۔ کسے علم ہے کہ اس نے اپنی منزل کو پانے کے لئے زندگی کے اٹھائیس قیمتی سال اپنے فن کی بھینٹ کئے ہیں ——— دنیا کی نگاہیں فقط آج کے لقب یافتہ فضل سے متعارف ہیں ———

آج کا فضل محمود

- اوول کا ہیرو
- پاکستانی ایک بیڈ سر

نہیں بلکہ

- اپنی طرز کا منفرد اور عظیم ترین باؤلر
- مادرِ وطن کا مایہ ناز سپوت
- پاکستان کرکٹ کی لاج کا رکھوالا

مبصّرین کی دلچسپ آراء کے اقتباسات

الف گوور

"ایک عظیم کرکٹر کو کھیل کے میدان کے اندر اور باہر جیسا کہ ہونا چاہیئے۔ فضل محمود اس کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وہ ایک کلیدی باؤلر اور درست انداز کھلاڑی ہے اور اپنے طرز اور فن میں ایلک بیڈسر سے پوری طرح مشابہہ ہے۔"

ایلک بیڈسر

"اگر مجھے انگلش کرکٹ کا "فضل" سمجھا جائے تو میں پورے طور پر مطمئن ہوں۔ انگلستان نے اَن تھک فضل محمود سے بہتر باؤلر کم ہی دیکھے ہیں۔"

جے۔سی۔مکرجی

"کاش ہمارے ہاں بھارت میں بھی کوئی ایسا باؤلر ہوتا۔"

ڈبلیو۔ ای۔ باؤز (دی کرکٹر)

"پاکستانی کھیل کا اصل ہیرو فضل محمود تھا۔"

الیگزینڈر

"کپتان۔ اے۔ ایچ۔ کاردار خوب جانتا ہے کہ اسے اس تمام فتح کے لئے ایک ہی شخص کا ممنون ہونا چاہیئے اور وہ ہے ___ فضل محمود جو ایک میڈیم پیس باؤلر ہے۔ اور جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

رائٹر

"اوول ٹیسٹ میچ کا ہیرو پاکستانی ٹیم کا وائس

کپتان فضل محمود تھا۔ اس نے پورے جلال کے ساتھ باؤلنگ کیا اور کوئی بھی انگریز بیٹسمین دلجمعی سے اس کا سامنا نہ کر سکا۔"

سعید احمد خاں

جائنٹ سیکرٹری بورڈ آف کنٹرول فار کرکٹ۔ پاکستان

"فی الواقعہ فضل محمود اپنے ملک کی شہرت کے اضافہ اور پاکستانی پولیس کے وقار کو بلند کرنے کا موجب ہوا ہے۔ اور انگلستان میں اس کے متعلق یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "انگلش ٹیم بڑی بُری طرح سے فضل زدہ ہو گئی تھی۔"

مہاراج کمار و زیانگرم

مشہور زمانہ استاد فرینک ٹرینٹ نے ایک

موقعہ پر امر سنگھ مشہور باؤلر سے کہا تھا کہ اس کا
فن عطیۂ خداداد ہے۔ اور اس میں دخل انداز
ہونا اس کے جوہر اصلی کو ضرر پہنچانا ہے۔ یہی
مثال فضل محمود پر ہو بہو صادق آتی ہے۔ میں امید
کرتا ہوں کہ وہ اپنے فن کی ترقی کے لئے بیڈسر
لنڈول۔ ویلنٹائن۔ ٹے فیلڈ الیسوں کی طرف
نہ دیکھے گا کیونکہ وہ موجودہ وقت میں اپنی طرز
کا عظیم ترین باؤلر ہے۔"

شکریہ

ہم اس کتاب کی حسب ذیل تصاویر کی اشاعت کے لئے انگلستان کی مندرجہ ذیل فرموں کے ممنون ہیں جن کی عنایت سے یہ تصاویر شائع کی جاسکیں۔

تصویر بالمقابل صفحہ ۱۴۴ دی سپوٹ اینڈ جنرل پریس لمیٹڈ۔ لنڈن

" " ۱۶۲ پوسٹ اینڈ میل۔ برمنگھم

تصویر بالمقابل صفحہ ۲۴۵ دی سنٹرل پریس فوٹوز لمٹیڈ۔ لندن

″ ۲۴۶ ″

″ ۲۴۷ ″

″ ۲۵۰ ″

″ ۲۵۲ ″

″ ۲۵۵ ″

″ ۲۵۶ ″

″ ۲۶۰ ″

تصویر بالمقابل صفحہ ۲۶۵ دی سنٹرل پریس فوٹوز لمیٹیڈ۔ لندن۔

" ۲۶۶ "

" ۲۶۷ "

" ۲۶۸ "

" ۲۷۰ "

" ۲۷۲ ڈیلی ہیرلڈ لندن

خواجہ بدرالاسلام فروغی پرنٹر پبلشر نے یہ کتاب اشرف پریس لاہور
اور تصاویر و گرد پوش نشاط آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر
"دارالبلاغ" لاہور سے شائع کی۔

دار البلاغ لاہور کی خصوصیاتِ عمل

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ناول، افسانہ انقلاب انگیز خیالات کی وسیع نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ بلند پایہ علمی مسائل کو بھی عوام الناس تک پہنچانے کیلئے افسانوی ادب عظیم الشان خدمات سرانجام دے سکتا ہے اسی لئے ہم نے افسانوی ادب کی اشاعت کو اپنے لائحہ عمل میں جگہ دی ہے۔

(ہم ۱) تجارتی مصالح کیساتھ ساتھ قوم و ملک کی پُرخلوص خدمت کا زوردار جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔

(ہم ۲) پست مذاق کی تسکین کیلئے فحش، عریاں، قابلِ نفرت، بیہودہ اور تخریبی لٹریچر شایع کر کے تجارتی فوائد حاصل کرنے کی بجائے۔ ایسا حیات افروز ادب پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے اسلامی نظریات کی افادیت کا نوجوانوں کو احساس ہو۔ حصولِ آزادی کے بعد خالص اسلامی بنیادوں پر قومی تعمیر ہی وقت کا سب سے اہم فریضہ ہے کیونکہ راسخ العقیدہ اور ذہین قوم ہی زمانہ حال کے طوفانی حوادث کا مضبوطی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

(ہم ۳) کوئی کتاب اس کی افادی حیثیت کا اندازہ لگائے بغیر شایع نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے ڈھب کے فاضل مصنفین کو تلاش کر کے اور اُن کی ہر طرح سے خدمت و دلداری کر کے ان سے ایسی کتابیں مرتب کرا کے شائع کرتے ہیں جو قوم و ملک میں زبردست تعمیری قوت پیدا کرنے کا موجب ہوں۔

(ہم ۴) خوش ہیں کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ نے بہت جلد محسوس کر لیا ہے کہ ان مفید، دلچسپ اور آراستہ و پیراستہ کتابوں کی اشاعت سے ہمارے اخلاق، معاشرت، تہذیب اور تمدن کی کس قدر اصلاح ہو سکتی ہے۔ علم دوست حضرات کا ادبی فرض ہے کہ وہ اپنے اس محبوب اور عظیم الشان علمی و ادبی ادارہ کی سرپرستی [illegible] فرمائیں اور کوئی لائبریری کوئی ادارہ ایسا نہ رہے۔ جس میں ہماری شاندار مطبوعات کو عزت و افتخار سے [illegible] گیا ہو۔ علاوہ ازیں کتابوں کی فراہمی میں بھی براہِ راست ہم سے تعاون فرما کر ہم ادارہ کو مضبوط بنانے میں ہماری [illegible] فرمائیں تا کہ جو خدمت مقصد لیکر اُٹھے ہیں اس میں بہت جلد ہمیں کامیابی نصیب ہو۔

(خواجہ) بدر الاسلام فردغی
ڈائرکٹر۔ دار البلاغ۔ لاہور